Phone [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

مارچ 1966

## خوش آمدید

گذشتہ جنگ میں ہمارے جو مجاہدین میدان کارزار میں لڑتے ہوئے گرفتار ہو گئے تھے وہ اب ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر واپس پاکستان پہنچے ہیں۔ ہم اپنے ان بہادر نبرد آزماؤں کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہوئے انہیں تہ دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ انہیں ہندو جیسے کمینے دشمن کی قید و بند میں جس قسم کی صبر آزما تکالیف برداشت کرنی پڑی ہوں گی، ہمیں اس کا اندازہ ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے ان وفا شعار مجاہدوں نے وہاں لرزہ انگیز مصائب میں بھی اپنے پاؤں میں لغزش نہیں آنے دی اور دشمن کا ہر حربہ ناکام بنا کر رکھ دیا۔ قوم اپنے ان استقامت اور استقلال کے مجسموں پر جس قدر بھی فخر کرے، کم ہے۔ مجاہدینِ پاکستان! زندہ باد

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

## اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

# اسلام کیا ہے

## پرویز

ہمارا یہ دعوےٰ ہے (اور مبنی بر ایمان دعوےٰ) کہ اسلام، نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بحیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دل کش انداز میں یکجا پیش کیا جائے ——— یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے۔ اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اوّل۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ حسین گردپوش۔ قیمت فی جلد۔ آٹھ روپے۔

قسم دوم۔ مکینیکل پیپر۔ بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے۔

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
# طلوعِ اسلام
لاہور

بدل اشتراک
سالانہ — پاک ہند سے — دس روپے
سالانہ — غیر ممالک سے — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۹ — مارچ ۱۹۶۶ء — نمبر ۳

## فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| (۱) | لمعات | ۲ |
| (۲) | طلوعِ اسلام کنونشن | ۷ |
| (۳) | کمیونزم اور اسلام (محترم پرویز صاحب) | ۹ |
| (۴) | اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید (محترم ابوشہاب صاحب) | ۴۱ |
| (۵) | پاکستان کی اندرونی جنگ | ۴۹ |
| (۶) | پاکستان کی نئی زیارت گاہیں (۲) (محترم پرویز صاحب) | ۶۱ |
| (۷) | روس کا عالمی کردار (محترم خورشید عالم صاحب) | ۶۸ |
| (۸) | بچوں کا صفحہ (میں نے چھب ورجوڑیاں میں کیا دیکھا) (عزیزہ سلمیٰ پرویز) | ۷۵ |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

پاکستان کی فضا میں آئے دن نئے نئے سیاسی نعرے اور صدائیں گونجتی سنائی دیتی ہیں۔ مختلف سیاسی پلیٹ فارموں سے نئے نئے مطالبات منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ یہ سب نعرے عوام کی نمائندگی کے دعوے کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کا تجزیہ کریں اور ان کے پس منظر پر نگاہ ڈالیں۔ تو ان میں سے اکثر و بیشتر صداؤں کا اصل مقصد سیاسی مفاد پرستیوں اور حصولِ اقتدار کی کشمکش سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کہیں پختونوں اور پنجابیوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر، کہیں سندھیوں کے جداگانہ قومی تشخص کے نقاب میں، کہیں بنگالیوں کے حق خود ارادیت کی خاطر، آپ دیکھیں گے کہ جس سیاسی طالع آزما کو اپنی ہوسِ اقتدار کے لئے کوئی نعرہ زیادہ کار آمد اور سازگار نظر آتا ہے۔ وہ اُسے لے کر میدان میں چلا آرہا ہے اور اس کا قطعاً احساس نہیں کہ اس سے ملکی سالمیت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس سے قوم کی وحدت و اتحاد کے تقاضے کیونکر زیروزبر ہو کر رہ جائیں گے۔ اس سے حیاتِ ملی میں کس قدر انتشار رونما ہوگا۔ کوئی قطعاً نہیں سوچتا کہ یہ نعرے بازی اور ہنگامہ آرائی اس مملکت کو کس انجام سے دوچار کرے گی جس کے حصول و قیام کے لئے اس قدر عظیم جنگ لڑی گئی۔ اور جس کے دفاع و تحفظ کے لئے سینکڑوں ماؤں کے نورِ نظر قربان ہوئے اور ہزاروں انسانوں کو بیش بہا قربانیاں دینی پڑیں۔

اسی نوعیت کا ایک نعرہ ابھی ابھی ملک میں گونجتا سنائی دیا ہے۔ یہ شر انگیز نعرہ مشرقی پاکستان کی خود مختاری کے نام پر بلند ہوا۔ اور مشرقی پاکستان کے ایک طالع آزما (شیخ مجیب الرحمٰن صاحب)

اس کے محرک تھے۔ انہوں نے حزبِ اختلاف کی نیشنل کانفرنس لاہور کی مجلس مضامین (SUBJECT COMMITTE) میں اس سلسلے میں جو تجویز پیش کی اس کے مسودے کا عکس مذکورہ کانفرنس کے خاتمہ پر بعض اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کے مطابق ان صاحب کا مطالبہ یہ تھا کہ ۔۔

ملک کا آئینی ڈھانچہ تبدیل کر کے ایسے وفاق کی بنیاد رکھی جائے جو مشرقی، اور مغربی پاکستان کی دو خود مختار ریاستوں پر مشتمل ہو۔ مرکزی حکومت کو صرف دفاع اور امور خارجہ سے تعلق ہو۔ باقی تمام معاملات میں دونوں ریاستیں کاملاً خود مختار ہوں۔

کرنسی کے بارے میں دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کی جا سکتی ہے یا تو دونوں ریاستوں میں جدا جدا کرنسی رائج ہو۔ یا پھر ملک بھر کے لئے ایک ہی کرنسی ہو۔ اس صورت میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان میں سرمایہ منتقل کرنے پر مؤثر آئینی پابندیاں عاید ہوں۔ علاوہ بریں مشرقی پاکستان کے لئے بنکنگ ریزرو کا الگ انتظام ہو۔ یا مشرقی پاکستان کے لئے جداگانہ مالیاتی پالیسی اختیار کی جائے'

کوہستان - ۱۰- فروری ۶۶ء

یہ شیخ مجیب الرحمن وہی صاحب ہیں جنہوں نے گذشتہ انتخابات کے زمانے میں یہ اعلان فرمایا تھا کہ اگر ان کی پارٹی کو برسرِ اقتدار آنے کا موقعہ مل گیا تو وہ بھارت سے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کریں گے۔ پاکستان جس صورت حال کا سامنا کر رہا ہے' اور اس صورت حال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لئے ہماری قومی صفوں میں جس قدر وحدت و اتحاد کی ضرورت ہے' اسی کی روشنی میں اندازہ لگائیے' کہ علیحدگی کا یہ رجحان ہمیں کس تباہی سے دوچار کر سکتا ہے اور یہ ذہنیت قومی منافرت کے کس جہنم کو دعوت دے رہی ہے۔ اس قسم کے نعرے پہلے بھی کئی بار بلند ہوتے رہے اور علیحدگی کا یہ رجحان اس سے قبل بھی قومی زندگی میں فتنہ و شر کی چنگاریاں بکھیرتا رہا۔ کوئی تیرہ چودہ برس ادھر کا ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان میں یہ تحریک بیدار کی گئی کہ اس صوبے کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔ اس تحریک نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ اور تو اور خود ہمیں بھی مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ ملک کی سالمیت کی خاطر اس تجویز کو مان لیا جائے۔ لیکن بعد کے حالات سے جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس تحریک کے پس پردہ کیا کیا محرکات کارفرما تھے' تو ہم نے ملک کو اس سے متنبہ کیا۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ مرکز

کو ہر قیمت پر مضبوط رکھنے کے لئے وحدانی طرز حکومت اختیار کیا جائے اور ہر دو حصوں میں ذہنی تربیت کی ایسی مؤثر صورت پیدا کی جائے جو اسلامی آئیڈیالوجی کی قدر مشترک سے سب کے دلوں کو جوڑ دے۔ مئی ۱۹۶۰ء میں آئین کمیشن کے سوالنامہ کے سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بھی ہم نے لکھا تھا کہ نئے آئین کے تحت ملک میں وحدانی طرز حکومت قائم کیا جائے اور اس کے لئے ـــــ

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں صرف ایک ایک گورنر ہو اور گورنر کی مجلس مشاورت (کابینہ) ہو الگ پارلیمانیں نہ ہوں۔

(طلوع اسلام - مئی - جون ۱۹۶۰ء)

لیکن افسوس کہ نئے آئین کی ترتیب کے سلسلے میں ہماری اس تجویز کو قابل قبول نہ سمجھا گیا۔ اور وحدانی طرز حکومت کو نظر انداز کر کے وہ صورت برقرار رکھی گئی جو صوبائی عصبیت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو وقتاً فوقتاً بھڑک اٹھنے کے مواقع فراہم کرتی رہے۔ چنانچہ ہم سب نے دیکھ لیا کہ موجودہ طرز حکومت میں یہ خطرہ برابر موجود ہے اور موجود رہے گا کہ کوئی طالع آزما جب جی چاہے اس خاکستر کو ہوا دے اور ان چنگاریوں کو بھڑکا کر ملک کی سالمیت کو خطرے میں ڈال دے۔ ہمارے نزدیک ملک کو اس فتنہ و شر کے ہنگاموں سے بچانے کا سیاسی حل وحدانی طرز حکومت کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرز حکومت کے تحت صوبائی اسمبلیوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اور مرکز قانون سازی کا سرچشمہ قرار پا جاتا ہے۔ یہ صورت علیحدگی کے رجحان کو سیاسی طور پر ختم کر سکتی ہے اور اسی سے ان شر انگیزیوں کے سر اٹھانے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔

لیکن یہ اس صورت حال کا سیاسی اور ہنگامی حل ہے۔ مستقل اور قطعی حل نہیں۔ اس کا مستقل حل وحدت مقصد کے ذریعے پیدا ہو سکتا ہے اور ہمیں افسوس سے یہ عرض کرنا پڑے گا کہ اس وقت تک جو سیاسی طوفان اٹھتے رہے ہیں اور مفاد پرستیوں نے ہنگاموں کو قدم قدم پر جنم دیا۔ انہوں نے قوم کو وحدت مقصد کی نعمت سے بے نصیب کر دیا ہے۔ ہم نے جب تحریک پاکستان کے نام پر اپنے منظم اور طاقتور دشمن کے مقابل حق خود ارادیت کے حصول کی جنگ لڑی تو اس معرکہ آرائی کے فاتحانہ انجام کا باعث وحدت مقصد کے سوا کچھ نہ تھا۔ رنگون سے لے کر پشاور تک ہماری ملت کے کروڑوں افراد کے سامنے

ایک مقصد اور ایک منزل تھی۔ اس جنگ میں کوئی بھی بنگالی، پنجابی، سندھی اور پٹھان کی حیثیت سے شریک نہیں تھا۔ سب ایک ملتِ واحدہ کے افراد کی حیثیت سے ایک بنیان مرصوص کی سی وحدت میں ڈھل گئے تھے۔ انہوں نے یہ ملک ایک قوم کی حیثیت سے اور ایک قوم کے نام پر حاصل کیا اور اس وقت یہ کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اس مملکت میں پنجابی، بنگالی، سرحدی اور سندھی کے نام قومی تشخص کی حیثیت سے ابھریں گے۔

آج بھی مملکتِ پاکستان کی سالمیت اور بقاء و استحکام کا جذبۂ محرکہ وحدتِ مقصد کے سوا اور کوئی نہیں بن سکتا۔ جب ہم نے اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کی وجہ جواز کے طور پر اپنے آپ کو ایک قوم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ تو اس ایک قوم کے دعوے کی بنائے اشتراک وطن، صوبے، رنگ یا نسل کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ یہ بنائے اشتراک اسلام اور صرف اسلام تھا۔ یہ دعویٰ تھا کہ چونکہ ہم سب مسلمان ہیں۔ اسلئے ہم ایک قوم ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن یا اس قسم کے علیحدگی پسند دوسرے لوگ یہ کہیں گے کہ بحمدللہ ہم اب بھی مسلمان ہیں۔ ہم سب ایک ہی کلمہ پڑھتے ہیں اور جب تک ہم ایک ہی کلمہ پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارے مسلمان اور ایک قوم ہونے میں شک کیا ہے۔؟ لیکن اتنا کہنے سے اسلام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ایسا کہنے سے ہم حقیقی طور پر ایک قوم نہیں بن جاتے۔ دین و ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کی صورت میں متشکل ہونے کا مقصد یہ ہے کہ جن قرآنی اصول و اقدار پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں پاکستان میں ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے عملاً متشکل کیا جائے۔ قرآن کریم کی تعلیمات اور منشار و مقصود ایک زندہ حقیقت بن کر ہماری اجتماعی زندگی میں محسوس و مشہود طور پر رائج ہو۔ یہی وہ وحدتِ مقصد ہے جو ہمیں صحیح معنوں میں ایک قوم بنا سکتی ہے اور جب یہ صورتِ حال ہمارے معاشرے میں عملاً متشکل ہو جائے تو افرادِ ملت میں کوئی دوسری بنائے اشتراک باقی نہیں رہ سکتی یہ وحدتِ مقصد صوبائی اور نسلی عصبیتوں کا وجود تک ختم کر دیتی ہے۔ اس ایک مرکزِ فکر و عمل کو اپنا لینے کے بعد پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد کے لات و منات چکنا چور ہو کر رہ جاتے ہیں اور کوئی مجیب الرحمٰن ملت کی اس ناقابلِ تقسیم وحدت کو صوبائی خود مختاری کے نعروں سے تفریق و تشتت کے شرک سے متاثر نہیں کر سکتا۔ کارفرمایانِ مملکت کے

کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ قومی فکر و عمل میں ان نظریات و تصورات کی عملی کیفیات راسخ کر دیں جن کی بدولت مسلم قوم کا وجودِ حقیقی متشکل ہوتا ہے۔

اس وحدتِ مقصد سے محرومی اور بے نصیبی کا نتیجہ ہے کہ آج اس مملکت کا کوئی فرد نہ ملک کے مفاد کو اپنا مفاد سمجھتا ہے اور نہ اس کے نقصان کو اپنا نقصان۔ جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلاں اقدام سے ملک کو نقصان پہنچے گا تو ملک کے عوام اس کا کوئی گہرا اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے ان کا کیا نقصان ہو گا نقصان ہوگا تو ان دو تین سو خاندانوں کا جو ملک کی دولت سمیٹ کر کروڑپتی — اور ارب پتی بن بیٹھے ہیں۔ اور اگر عوام سے یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کام کرنے سے ملک کو فائدہ پہنچیگا تو وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں بھلا اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر کوئی فائدہ پہنچے گا تو ان کو جو اپنے کاروبار اور ملوں کے زور پر ایک ایک روپے سے دس دس پیدا کر رہے ہیں۔ سوچئے کہ یہ ذہنی ردِّ عمل جو افرادِ مملکت میں پیدا ہو چکا ہے کیسے ہولناک رجحان کی نشان دہی کر رہا ہے۔ جب ایک مملکت میں صورت یہ پیدا کر دی گئی ہو کہ چند سو خاندانوں کو معاشی اجارہ داری حاصل ہو۔ اور باقی کروڑوں ان کی جلبِ زر کے ہاتھوں ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہوتے جا رہے ہوں۔ تو محض ایک کلمہ پر زبانی ایمان رکھنے سے وہ کیونکر وحدتِ مقصد اور وحدتِ ملت کی سلکِ تنظیم میں پروئے جا سکتے ہیں۔ انہیں کیونکر ایک مشترک مفاد اور مشترک مقصد پر لایا جا سکتا ہے۔ وہ کیونکر صحیح معنوں میں ایک قوم کے افراد قرار پا سکتے ہیں۔

آج پاکستان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کے افرادِ مملکت میں نہ نظری طور پر وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ عملی طور پر ان کی زندگی میں قرآن کا وہ معاشی نظام بروئے کار لایا گیا جو معاشی عدل و مساوات کی سطح پر لا کر انہیں اسلامی اخوت کے سچے جذبے سے سرشار کر سکے — "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ" — کے زبانی اقرار سے تو افراد میں بنائے اشتراک پیدا نہیں ہو سکتی۔ اتنا کہہ دینے سے تو وہ بھائی بھائی اور ایک ملت کے افراد نہیں بن سکتے یہ کچھ اگر ممکن ہو گا تو صرف اس تصورِ حیات (IDEALOGY) کو افرادِ مملکت کی زندگی میں عملاً متشکل کرنے سے جس پر ہم زبانی ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔

لا الٰہ الا اللہ تو ایک فارمولا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی فارمولا کو زبانی دھراتے رہنے

سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ اس کا نتیجہ اسے عمل میں لانے ہی سے سامنے آسکتا ہے۔ لہذا جب تک اسلامک آئیڈیالوجی ایک جیتے جاگتے نظام کی صورت میں متشکل نہیں ہوگی ۔۔ لا الٰہ الا اللہ کے الفاظ اپنے حقیقی نظامِ توحید کی شکل اختیار نہیں کریں گے۔ جب تک دین وایمان کی یہ قدرِ مشترک لباسِ مجاز میں جلوہ گر نہیں ہوگی، افرادِ ملت میں وہ سچی وحدت اور اتحاد کبھی قائم نہیں ہوگا جو پاکستان کی سالمیت کی ضمانت قرار پاسکے اور صوبائی تعصبات اور علاقائی خود مختاری کے فتنہ و شر کو ہمیشہ کے لئے ختم کردے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اشد ضروری ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اس طرح بدلا جائے کہ ہماری آنے والی نسلیں فقط مسلمان کی حیثیت سے سامنے آئیں۔ اور ان کی اس حیثیت کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے

---


# طلوعِ اسلام کنونشن

تجویز ہے کہ طلوعِ اسلام کنونشن حسبِ سابق

بی-۲۵ گلبرگ لاہور میں بتاریخ ۱۸-۱۹-۲۰ مارچ

کو منعقد کی جائے!

اسکے متعلق طلوع اسلام کی بزموں کو گشتی چھٹی لکھ دی گئی ہے اور مزید تفصیلی ہدایات ابتدائے مارچ میں بھیجی جائینگی۔ ارکین بزم کے علاوہ دیگر حضرات صرف کھلے اجلاس میں شرکت کریں گے انکا پروگرام مقامی طور پر الگ شائع کیا جائے گا۔ اس مرتبہ کنونشن میں خطابات اور مذاکرے کے موضوع بہت اہم ہیں۔ کنونشن میں بک اسٹال لگایا جائیگا جہاں ادارہ کی

## کتابوں پر خاص رعایت

دی جائیگی

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ؛ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

آج یہی سوال ہر سوچنے والے مسلمان کی زبان پر ہے کہ

ہم اقوامِ عالم کے مقابلہ میں اِس قدر پست اور زبوں حال کیوں ہیں ؟

اس اہم سوال کا جواب

## پرویزؔ صاحب نے اپنی معرکہ آرا تصنیف

# اسبابِ زوالِ امّت

میں دیا تھا جس کے تین ایڈیشن اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں لیکن اب مصنّف نے پوری کتاب پر نظر ثانی کی ہے۔ چنانچہ اب اس کا

# تازہ ایڈیشن

شائع کیا گیا ہے جو پہلے ایڈیشنوں سے مختلف ہے۔ عام اشاعت کی غرض سے اس کا چیپ ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ اور قیمت ڈیڑھ روپیہ فی جلد رکھی گئی ہے

اپنی فرمائش جلد بھیجیے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

بِاسْمِہٖ تعالےٰ

# کمیونزم اور اسلام

پرویزؔ

# کمیونزم اور اسلام

۸ دسمبر (۱۹۶۵ء) کی شام پرویز صاحب نے، پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ پبلک ایڈمنسٹریشن کی دعوت پر، یونیورسٹی کیمپس میں، ایم۔ اے کے طلباء کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع، اسلام کا معاشی نظام تھا۔ پرویز صاحب اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے اور کہہ چکے ہیں؛ لیکن اس اجتماع میں یہ جس ربط اور تسلسل سے سامنے آیا اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ سارا مجمع (قریب قریب) ایک ہی علمی سطح کے افراد پر مشتمل تھا۔ یوں بھی، نوجوان طالب علم، پرویز صاحب کے پیغام کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے، اس خطاب کا انداز درسگاہ کے لیکچر کا سا تھا۔ خطاب کے خاتمہ پر سامعین کا تقاضا تھا کہ اسے ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ اس خطاب کو ساتھ کے ساتھ ٹیپ پر ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ جس سے اسے از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔

ابتدائی تعارف، تشکر اور تمہید کے بعد پرویز صاحب نے کہا:

عزیزانِ من! آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ اسلام زندگی کا ایک کُلی نظام پیش کرتا ہے، اور سیاسی، معاشرتی، معاشی، عمرانی نظام سب اس کُلی نظام کے مختلف اجزاء ہیں۔ لیکن اِن اجزاء اور اُن کے کل میں باہمی تعلق ——— ابتدائی سائنس کی اصطلاح میں ——— مکسچر یا آمیزہ کا سا نہیں ——— کمپونڈ یا مرکب کا سا ہے۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ مکسچر کے تمام اجزاء اپنی اپنی خصوصیات اسی طرح برقرار رکھتے ہیں لیکن مرکب میں ان کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ (مثلاً) پانی مرکب ہے ہائیڈروجن اور آکسیجن کا۔ ہائیڈروجن بڑی تیزی سے جلتی ہے اور آکسیجن ہر شے کے جلنے میں مدد دیتی ہے لیکن دونوں کے مرکب (پانی) کی خصوصیات ان سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص، ہائیڈروجن اور آکسیجن کی الگ الگ خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہے

کہ اس نے پانی کی خصوصیات کو سمجھ لیا ہے۔ تو وہ ایک بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہوگا ــــ اس سے آگے بڑھیئے اور خود انسان کو لیجئے۔ اگر کوئی شخص علم تشریح الابدان (اناٹومی) کی رُو سے انسانی جسم کے مختلف اجزاء ــــ دل، گردہ، پھیپھڑے، جگر، حتیٰ کہ دماغ تک کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہے۔ کہ اس نے "انسان" (یا اُس فرد) کے متعلق سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ تو وہ کس قدر غلط فیصلے پر پہنچیگا! یہی کیفیت اسلام کے متعین کردہ نظامِ کُلی کے ان اجزاء کی ہے۔ اگر ان اجزاء کا الگ الگ مطالعہ کرنے کے بعد یہ تصور کر لیا جائے۔ کہ ہم نے اسلام کے نظامِ کلی کو سمجھ لیا ہے۔ تو ایسا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کے نظامِ حیات کا صحیح تصور سامنے رکھا جائے۔ اور اس کے بعد دیکھا جائے۔ کہ اس کلی نظام میں یہ اجزاء کیا کیا کام کرتے ہیں۔ اور اُس نصب العین کے حصول میں کس طرح ممد و معاون ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ مختلف نظام، مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یہ مقصد کیا ہے اور مختلف نظام ــــ یا کم از کم معاشی نظام ــــ اس مقصد کے حصول میں کس طرح ممد و معاون ہوتے ہیں، یہ وہ سوال نہیں جن کا جواب ایک نشست میں دیا جا سکے۔ اسے تو ہماری درسگاہوں کا نصابِ تعلیم ہونا چاہیئے تھا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آسکتی تھی۔ کہ اسلام کیا ہے اسلامی معاشرہ کسے کہتے ہیں۔ اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں۔ اور مقصود و مطلوب کیا ــــ میں بہرحال کوشش کروں گا۔ کہ اس مختصر سے وقت میں اس امر کی وضاحت کروں کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور اس کے پیش کردہ کلی نظام میں اس کا مقام کیا۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

---

## معاشی نظام کی اہمیّت

قرآنِ کریم کی رُو سے انسانی زندگی میں معاشیات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ سورۃ النحل کی ایک آیت سے لگائیے جس میں اس نے ایک مثال سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے ــــ قرآن کریم کا یہ عام انداز ہے۔ کہ وہ مجرد حقائق کو محسوس تمثیلات سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ میں کہا گیا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ ایک بستی تھی بڑی مطمئن اور خوشحال۔ چاروں طرف سے سامانِ زیست بڑی فراوانی سے اس کی طرف چلا آتا تھا فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ۔ لیکن اس کے باشندوں

نے کفرانِ نعمت کیا۔ جس مقصد کے لئے انہیں یہ سب کچھ دیا گیا تھا۔ اُسے اس کے لئے استعمال نہ کیا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔ اور (یہی نہیں بلکہ) خود اس قوم کی ہستی خطرے میں پڑ گئی۔

یہ کچھ کیوں ہوا۔ اس کا جواب قرآن کریم نے ایک لفظ میں دے دیا ہے۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲) کہا کہ یہ کچھ یونہی نہیں ہو گیا۔ خدا کسی قوم کو یونہی بیٹھے بٹھائے مبتلائے عذاب نہیں کر دیتا۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے رزق کی تقسیم کے صحیح نظامِ خداوندی کو چھوڑ کر، ایک (غلط) نظام خود وضع کیا۔ رزق تو وہی ہوتا ہے۔ اگر اس کی تقسیم خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق کی جائے تو اس کا نتیجہ ہر ایک کی خوش حالی ہوتا ہے۔ اگر اس کی جگہ انسانوں کا خود ساختہ نظام لے لے۔ تو اس کی تقسیم ناہموار ہو جاتی ہے اور ان ناہمواریوں کا نتیجہ غربت، افلاس اور بیرونی خطرات ہوتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ گئی کہ اگر کسی قوم میں رزق کی قلت ہے۔ اور یہ قلت ہنگامی طور پر پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اس قوم کا نہج زندگی ہی ایسا ہو چکا ہے۔ یا اس قوم کو ہر وقت اپنی جداگانہ ہستی اور آزادی کے متعلق خطرہ لاحق رہتا ہے۔ تو اس قوم کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ اسے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہے۔

## قانونِ خداوندی سے اعراض

اس حقیقت کو سورۃ طٰہٰ کی ایک آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ جو قوم ہمارے قوانین سے اعراض برتتی ہے۔ ان سے پہلو تہی کرتی ہے۔ گریز کی راہیں نکالتی ہے تو اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جو قوم غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہی ہو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی زندگی قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں۔ وہ ان سے اعراض برت رہی ہے۔

ہمارے ہاں اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور پستی میں گزرتی ہے۔ تو کوئی بات نہیں۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی ہے۔ کامیابی اور کامرانی تو اس کی ہے جس کی آخرت سنور جائے۔ یہ دنیا مومنین کے لئے ہے ہی نہیں۔ اُن کے لئے آخرت کی زندگی ہے (بلکہ) خدا کے مقبول بندوں کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں غربت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کھانے کو روٹی، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان۔ یہ ہیں اللہ کے بندوں کی نشانیاں

آخرت میں بھی لوگ جنت کی آسائشوں کے مالک ہوں گے۔ یہ ہمارے ہاں کا عام عقیدہ ہے اور اسے محراب و منبر سے ہمیشہ دھرایا جاتا ہے۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی جو آیت ابھی ابھی میں نے پیش کی ہے، وہ پوری آیت نہیں آدھی ہے۔ پوری آیت یوں ہے:۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۔ (۲۰/۱۲۴)

جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور اُسے قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۔ (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی گیا گزرا۔

آپ نے غور فرمایا، عزیزانِ من! کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے؟ یہ ہے کہ

(۱) جو قوم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتتی ہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور

(۲) جس قوم کی روزی (اس دنیا میں) تنگ ہو، سمجھ لو کہ اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی درخشندہ و تابناک نہیں، اُخروی زندگی میں بھی اس کا کچھ حصہ نہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے!
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا!
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آگے بڑھیئے:۔

## رزق کا معاملہ

یہ آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ کہ تمدنی زندگی میں (جس میں انسانوں کو مل جل کر رہنا ہوتا ہے) رزق

کا معاملہ کسی ایک فرد کا ذاتی معاملہ نہیں رہتا۔ یہ مسئلہ معاشرتی اور اجتماعی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے موجودہ معاشرہ میں ایک مزدور دن بھر مزدوری کی تلاش میں مارا مارا پھرے اور کہیں کام نہ مل سکے؛ تو وہ اور اس کے بچے رات کو بھوکے سوئیں گے۔ یا اگر اُسے مزدوری ملی ہے۔ لیکن اس کی اجرت اتنی نہیں جس میں اس کا، اور اس کے بال بچوں کا گزارا ہو سکے۔ تو انہیں اسی طرح دن کاٹنے ہوں گے۔ اس مزدور نے اپنی طرف سے حصولِ رزق کی پوری پوری کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی بھوک کا علاج نہ ہو سکا۔ یہ اس لئے کہ رزق کا معاملہ پورے معاشرہ کے ساتھ وابستہ ہے ــ کسی فرد کا الگ معاملہ نہیں ــ کسی جنگل یا صحرا میں ایک فرد، تنہا نہ امیر ہو سکتا ہے نہ غریب، اس کی یہ پوزیشن معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم، افراد کے رزق کے لئے معاشرہ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یعنی اُسے انفرادی مسئلہ کے بجائے معاشرتی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسی کو نظام کہتے ہیں۔ غلط نظام میں رزق کی تقسیم ناہموار ہوتی ہے ــ ایک کے کتوں کو دودھ اور گوشت ملتا ہے اور دوسرے کے بچے بھوکے سوتے ہیں ــ صحیح نظام میں ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ پر ہوتی ہے۔ جسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں مملکت (اسٹیٹ) کہا جاتا ہے۔ جو مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے، اُسے "حکومتِ خداوندی" کہا جاتا ہے۔ یہ مملکت لوگوں سے خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے، اس لئے یہ ان تمام ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے جنہیں انسانوں کے سلسلہ میں، خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ رزق کے متعلق خدا کی ذمہ داری ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

روئے زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

یہ ذمہ داری اسلامی مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اور افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۱)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ان (اور انہی جیسی دیگر) آیات سے عام طور پر یہ عقیدہ پیدا کیا جاتا ہے کہ جب رزق کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے سر لے رکھی ہے تو اس کے لئے پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ جس انسان کو پیدا کرتا ہے اس کے لئے رزق بھی ساتھ ہی مہیا کر دیتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ رزق کی پیدائش اور تقسیم کے لئے خاص نظام کی ضرورت ہے۔ مشیتِ خداوندی کی خلاف ورزی

ہے:

یہ عقیدہ غلط ہے اور اس کا ازالہ خود قرآن کریم نے کر دیا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے تمہیں دے رکھا ہے۔ اس میں سے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی دو۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ۔ کہ کیا ہم ان (محتاجوں) کی روٹی کا انتظام کریں جنہیں اگر روٹی دینا مقصود ہوتا۔ تو خدا خود روٹی دیتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۳۶/۴۷) ان سے کہو کہ تم کیسی کھلی ہوئی گمراہی میں ہو جو یہ کہتے ہو کہ جنہیں رزق دیا جانا مقصود ہو، انہیں خدا خود براہ راست رزق پہنچاتا ہے۔ اس نے صفحہ ارض پر رزق بکھیر دیا ہے۔ اسے ہر ایک ضرورت مند تک پہنچانا، انسانی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ جو معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے، وہ مشیتِ خداوندی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ رزق کی بہم رسانی خدا کے ذمے ہے اس نظامِ مملکت کو اس کی ذمہ داری سے آگاہ کرتی ہیں جو خدا کے نام پر متشکل ہوتا ہے۔

## معاشرہ، مملکت، نظام

میں نے یہاں معاشرہ، مملکت، نظام، افراد معاشرہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنی مفہوم بھی سمجھ لیا جائے۔ کہ جب تک ان کا صحیح تصور سامنے نہیں آئے گا۔ معاشی مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

اگر آج کوئی غیر مسلم مسلمان ہونا چاہے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لے۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ (ہم پیدائشی مسلمانوں کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں۔) لیکن قرآن کریم کی رُو سے مسلمان ہونے کے لئے کچھ اور ہی شرط ہے۔ مثال کے طور پر سمجھیے۔ کہ جب آپ کسی انجمن، کسی سوسائٹی، کسی کلب کا ممبر بننا چاہیں تو آپ کو اس کا فارم رکنیت پُر کرنا ہوتا ہے۔ فارم رکنیت پُر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس انجمن، اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط کی پابندی کا اقرار کرتے ہیں۔ اسلام بھی ایک برادری، ایک سوسائٹی متشکل کرتا ہے۔ اس سوسائٹی کی رکنیت کے لئے ایک معاہدہ ضروری ہے اس معاہدہ کی رُو سے ایک اقرار اس ممبر کی طرف سے ہوتا ہے اور دوسرا اقرار اس سوسائٹی کی طرف سے۔

وہ معاہدہ یہ ہے:-

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)

اس معاہدہ کی رُو سے، اس سوسائٹی کا ممبر اپنا جان اور مال، خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں، خدا اس کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ اُسے جنّت عطا کرے گا۔

یہ معاہدہ، افراد اور اسلامی مملکت کے درمیان ہوتا ہے جو خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔

"جنت" کے متعلق ہمارے ذہن میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ یہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جا کر ملے گی۔ مرنے کے بعد، دوسری زندگی کی جنت اپنے مقام پر برحق اور اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن جنت اور جہنم کی زندگی کا نقشہ اس دنیا میں بھی سامنے آجاتا ہے۔ غلط (غیر قرآنی) معاشرہ جہنم کا نمونہ ہوتا ہے، اور صحیح (قرآنی معاشرہ) میں زندگی جنت بداماں گزرتی ہے۔ اس جنت کے متعلق جو اس دنیا میں متشکل ہوتی ہے اور جس کی ذمہ داری، اسلامی مملکت لیتی ہے۔ کہا گیا ہے:-

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ. وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۲۰/۱۱۹)

اس میں نہیں نہ بھوک کا خوف ہوگا، نہ کپڑوں کی فکر، نہ اس میں پیاس کی تکلیف ہوگی، نہ مکان کی تنگی؛

دوسری جگہ ہے کہ اس جنت کی کیفیت یہ ہوگی کہ

وَكُلَا حَيْثُ شِئْتُمَا. (۲/۳۵)

انسان جہاں سے جی چاہے، نہایت فراوانی سے کھا پی سکے گا؛

آپ نے غور کیا عزیزان! کہ یہ معاشرہ، تمام افرادِ معاشرہ کو ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (خوراک، لباس، مکان، وغیرہ) کی ضمانت دیتا ہے۔ جو نظامِ معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا، اسے اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی طرف منسوب کرے۔ اسی لئے حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ

"جس بستی میں کسی شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہوگیا۔　　　(مسند امام احمد)

اور حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ:-

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا۔ تو خدا کی قسم! عمر سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے رزق کے مسئلہ کو، فرد کی انفرادی ذمہ داری کے بجائے کس طرح معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری بنا دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ جس دامن کا ایک ایک تار ہزاروں، لاکھوں، انسانوں کے مفاد کے ساتھ بندھا ہو جس کا تانا بانا پورے معاشرے میں باہمد گر پیوست ہو۔ جو معاشرہ کے مختلف النوع مسائل کے ساتھ اس طرح گتھا اور گندھا ہوا ہو۔ کہ کسی ایک کی حرکت باقی تمام عناصر کو متاثر کر دے۔ اس مسئلہ کو انفرادی قرار دینا، حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ قرآن کریم نے اسے اجتماعی مسئلہ قرار دے کر اس کی اصل و بنیاد کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے نظام معاشرہ کا اولین فریضہ یہ قرار دے دیا کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے۔

## ملکیتِ زمین

سوال یہ ہے کہ معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح کرے گا؟ اس کے لئے ایک چیز بالکل واضح اور بدیہی ہے اور وہ یہ کہ معاشرہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتا۔ جب تک وسائل پیداوار پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ وسائل و ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے۔ (اشیائے خورد و نوش کے علاوہ، جملہ مصنوعات کے لئے خام مصالحہ یہیں سے ملتا ہے) اس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا کہ اس پر انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)

زمین کو ہم نے تمام مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے؛

اب ظاہر ہے کہ جو چیز تمام مخلوق کی پرورش کا ذریعہ بنائی گئی ہو۔ اُسے کسی فرد کی ملکیت میں کیسے دیا جا سکتا ہے؟ خدا نے ہوا کو اس لئے پیدا کیا۔ کہ وہ تمام جان داروں کی زندگی کا ذریعہ بنے۔ اگر ہوا کو انفرادی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس سے جس طرح بے شمار مخلوق دم گھٹ گھٹ کر مر جائے گی اُسکا تصور کیا جا سکتا ہے، لعینہٖ یہی پوزیشن زمین کی ہے۔ اس لئے اس نے کہا۔ کہ اسے انفرادی ملکیت کے بجائے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) رہنا چاہیئے۔ یعنی اس کا انتظام ایسا کرنا چاہیئے۔ کہ یہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر رہے۔ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۵۶/۷۳) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے متاعِ حیات۔ اس میں رِزْقًا لِّلْعِبَادِ (۵۰/۱۱) ہے۔ یعنی خدا کے تمام بندوں کے لئے رزق۔

قرآن کریم کی انہی آیات کی تشریح کرتے ہوئے نبی اکرم نے فرمایا۔ کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اسلئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

لہٰذا، زمین کو ایسی حیثیت دے دینا جس سے یہ تمام مخلوق کے لئے مشترکہ ذریعہ پرورش رہنے کے بجائے کسی فرد یا افراد کی ملکیت اور جائیداد بن جائے، اس مقصد کے خلاف ہوگا جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ یہ معاشرہ کی تحویل میں رہے گی اور معاشرہ ایسا انتظام کرے گا۔ جس سے ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق رزق ملتا جائے۔

## زمین اور ہوا میں فرق

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زمین یا ہوا (یا سورج کی روشنی) میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہوا، روشنی وغیرہ فطرت کی طرف سے تیار شدہ حالت میں ملتی ہے لیکن زمین سے، محنت کرکے، رزق حاصل کرنا پڑتا ہے اس لئے اس کی پیداوار، ہوا اور روشنی کی طرح عام نہیں کی جاسکتی۔ قرآن کریم اس سوال کا بھی جواب دیتا ہے اور نہایت شگفتہ اور دل نشین انداز میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا دعوے یہ ہے کہ ہم محنت کرکے زمین کو قابل کاشت بنا لیتے ہیں۔ اس میں ہل چلاتے ہیں تخم ریزی کرتے ہیں۔ پانی دیتے ہیں۔ اس طرح اس سے پیداوار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس پیداوار کے ہم واحد مالک ہیں۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں ھو سکتا۔ لیکن ذرا غور کرو کہ اس تمام کاروبار میں، تمہارا حصہ کس قدر ہے۔ اور ہمارا (خدا کا) کس قدر۔ بادنیٰ تدبر یہ بات سامنے آجائے گی۔ کہ یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار تھا۔ اس میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے۔ کہ پیداوار کا بنیادی ذریعہ (زمین) ہماری پیدا کردہ تھی۔ تمہاری نہیں تھی۔ اب اس سے آگے بڑھو۔ افرءیتم ما تحرثون۔ (۵۶/۶۳) جو کچھ تم بوتے ہو، کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے؟ امرا نتم تزرعونہ ام نحن الزارعون۔ تم فقط زمین میں بیج ڈالتے ہو۔ کہو کہ اس بیج سے فصل تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۔ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اگر ہمارا قانون زراعت ایسا نہ ہوتا تو فصل کا پروان چڑھنا تو ایک طرف، یہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی۔ اور تم ششدر اور حیران رہ جاتے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ ہمارا بیج بھی ضائع ہو گیا۔

پھر آگے بڑھو۔ افرءیتم الماء الذی تشربون۔ کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا ہے۔ جو تمہارے لئے وجہ زیست اور تمہاری کھیتی کے لئے ذریعہ پیداوار ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں۔ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ

اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ۔ اگر ہمارے نظام ربوبیت کا یہ تقاضا نہ ہوتا کہ نوع انسان کی پرورش ضروری ہے، تو ہم اسے ایسا کھاری بنا دیتے۔ جسے نہ تم پی سکتے۔ نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اُگ سکتیں تم اس کے سپاس گزار کیوں نہیں ہوتے۔

اور آگے بڑھو۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ۔ کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم روشن کرتے ہو۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ۔ کیا ان درختوں کو جن سے آگ کا سامان حاصل ہوتا ہے۔ تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں۔

تم ان واضح، بدیہی اور محسوس حقائق پر غور کرو کہ یہ سامانِ زیست جسے تم اپنی واحد ملکیت تصور کرتے ہو۔ اس میں ہمارا حصہ کس قدر ہے۔ اور تمہارا کس قدر؟ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً۔ ہم تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کرانا چاہتے ہیں۔ جسے تم فراموش کر چکے ہو۔ اس مشترکہ کاروبار سے جو کچھ حاصل ہوا ہے، اس میں سے تم اپنا حصہ لے لو، اور ہمیں ہمارا حصہ دیدو۔ تم پوچھو گے کہ آپ کا حصہ کسے دے دیں۔؟ ہمارا جواب یہ ہے۔ کہ ہم نے اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۵۶/۷۳-۷۹) بنایا ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامان زیست۔ اسے تم ان کے حوالے کر دو۔ یوں ہمارا حصہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی قرآنی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

## کمانے کی استعداد میں فرق

قرآن کریم نے جو کچھ ان آیات میں زمین کے متعلق کہا ہے، وہی کچھ وہ خود انسانی صلاحیتوں کے متعلق کہتا ہے۔ قارون کو قرآن نے نظام سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ

اُس کی ذہنیت یہ تھی کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ط (۲۸/۷۸) میری تمام دولت، میری اپنی ہنرمندی اور قابلیت کی بنا پر مجھے ملی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی اور دخل نہیں دے سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ ھِیَ فِتْنَۃٌ وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۹/۴۹) یہ ذہنیت بڑی غلط نگہی اور گمراہی پر مبنی ہے۔ لیکن لوگ اکثر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ کہ جو کچھ کوئی کماتا ہے وہ اس کی تنہا، واحد قابلیت یا کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں بالواسطہ اور بلاواسطہ پورے معاشرہ کی تگ و تاز بھی شامل ہوتی ہے۔ اس میں متعدد عناصر ایسے ہوتے ہیں جن میں اسے انفرادی طور پر کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت، ماحول، معاشرہ کا نظم و نسق، مناسب مواقع کا حصول دیگر افراد کا تعاون وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے جو کچھ ایک فرد کماتا ہے وہ بھی اس کی واحد ملکیت نہیں قرار پا سکتا۔ وہ ماحصل ہوتا ہے بہت سے دیگر عناصر کا۔ لہٰذا اسے بھی اسی نسبت سے بٹنا چاہیئے۔ اس نے اسے سورۂ نحل کی ایک آیت میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔ کہ بعض افراد میں، دوسروں کے مقابلہ میں، اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ صلاحیت (بنیادی طور پر) ہماری عطا کردہ ہوتی ہے مگر یہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِھِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ۔ جن لوگوں کو اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے وہ اس فاضلہ کمائی کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ درحقیقت انہیں کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ رزق ہوتا ہی ان کا ہے۔ اس لئے اسے ان کی طرف ہی لوٹا دینا چاہیئے لیکن لوگ ایسا نہیں کرتے اور کہتے ہیں۔ کہ فَھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ ۔ واہ! اسطرح تو گدھا گھوڑا سب برابر ہو گئے۔ اگر یہ کمائی انہیں دے دی جائے تو پھر ان میں اور ہم میں فرق کیا رہا۔

اب سنیئے ان کے اس اعتراض کا جواب۔ کہا اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)۔ یہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں کہ جو کچھ انہیں زائد حاصل ہوا ہے وہ ان اسباب کی وجہ سے ہے جو ان کے پیدا کردہ نہیں۔ بلکہ خدا کی طرف سے انہیں عطا ہوئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ یہ اس کمائی کے واحد مالک ہیں' ان کا اس حقیقت سے انکار ہے کہ اس میں کتنا کچھ ایسا ہے جو ان کا اپنا پیدا کردہ نہیں یہ عناصر وہ ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا۔ کہ وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ (۱۶/۵۳) یاد رکھو! یہ تمام اسباب و ذرائع۔ انعاماتِ خداوندی ہیں۔ تمہارے پیدا کردہ نہیں۔ اسلئے انکا ماحصل تمہاری واحد ملکیت نہیں ہو سکتا۔

اصل یہ ہے کہ یہ "کم اور زیادہ کمائی" کا تصور بھی سکے کا پیدا کردہ ہے۔ ایک مزدور اور ایک انجنیئر دن بھر کام کرتے ہیں۔ ہم مزدور کو شام کو تین روپے دیتے ہیں اور انجنیئر کو تیس روپے[1]۔ یوں مزدور کی کمائی انجنیئر کی کمائی سے کم ہوتی ہے۔ لیکن یہی مزدور اور انجنیئر (دو بھائی) اپنا مکان تعمیر کر رہے ہوں۔ تو اس وقت اُن کی کمائی میں کمی اور بیشی کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ دونوں کے ذمے کچھ کام ہوتا ہے اور وہ اس کام کو محنت سے سرانجام دیتے ہیں۔ لہٰذا کمائی میں کمی اور بیشی اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم کام کے معاوضہ کا معیار سکہ قرار دیں۔ جب صرف کام سامنے ہو تو کمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال ضروریات کا ہوتا ہے جسے معاشرہ پورا کرتا ہے۔

اسلامی نظام میں معاشرہ پوری کی پوری ملت کا اپنا گھر ہوتا ہے جس کی تعمیر اور تزئین تمام افراد کا فریضہ ہوتا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے مفروضہ کام کو فریضہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں اس لئے ان کے ہاں اس کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں قرآن کے معاشی نظام میں، جب وہ اپنی مکمل شکل میں قائم ہو، کمائی "کم اور بیش" ہوتی ہی نہیں۔

## دولت

عربی زبان میں "دولت" کے معنے گردش کرنے والی چیز کے ہیں۔ اور یہ بیشتر مشتمل ہوتی ہے، سونے اور چاندی کے سکوں (یا ان کے بدل کرنسی نوٹوں) پر۔ ان سکوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ شروع شروع میں، جب انسان کی تمدنی زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ نہیں تھی، لوگ اپنی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لئے اشیاء مستعملہ کا تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ (اسے انگریزی زبان میں بارٹر سسٹم سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ بعد میں جب زندگی پھیل گئی اور اشیاء کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا دقت طلب ہو گیا تو سکے رائج کئے گئے۔ یہ تبدیلی کی تو گئی تھی انسان کی سہولت کی خاطر، لیکن مفاد پرست گروہ نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اشیائے مستعملہ کا (جو اس زمانے میں بیشتر کھانے پینے کی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھیں) زیادہ عرصہ تک ذخیرہ کرنا مشکل تھا۔ اس لئے وہ بہر حال لوگوں کی

---

[1] مزدور کا معاوضہ تین روپیہ اور انجنیئر کا معاوضہ تیس روپیہ، طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا مقرر کردہ ہے۔ اگر مزدور انجنیئروں کی طرح کمیاب ہوں تو ان کا معاوضہ بھی تیس روپے ہو اور اگر انجنیئر مزدوروں کی طرح عام ہو جائیں تو ان کا معاوضہ تین روپے ہو جائے۔ غلط معاشرہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں مزدور عام رہیں تاکہ سرمایہ دار کو ان کی محنت کا معاوضہ زیادہ نہ دینا پڑے۔

ضروریات کو پورا کرنے کے لئے گردش میں رہتی تھیں۔ لیکن روپیہ پیسہ کو جب تک جی چاہے دبائے رکھا جا سکتا تھا۔ اس طرح اس گروہ نے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اور دولت، گردش میں رہنے کے بجائے، مالداروں کے دفینوں میں بند ہو گئی۔ دولت کی گردش کے رُک جانے سے جو مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دولت کو جس قدر گردش سے روکا جائے گا اسی قدر لوگوں کی ضروریات رُکی رہیں گی۔ قرآن کریم نے دولت کے جمع کرنے اور روک رکھنے کو سنگین جرم اور تباہی کا موجب قرار دیا ہے اس نے کہا کہ تباہی اور بربادی ہے اسکے لئے۔

الذی جمع مالاً و عددہ (۱۰۴/۲)

جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسکی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے

کہ وہ (ننانوے کے پھیر میں پڑ کر) اسے گنتا رہتا ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ اس روشِ زر اندوزی سے اس جہنم کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جسکے شعلے، دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ سورۂ معارج میں ہے کہ جہنم اس شخص کو آوازیں دے دے کر بلاتی ہے۔ جس کی کیفیت یہ ہو کہ جَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸) وہ دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ سورۂ ماعون میں ہے کہ دولت اور دیگر ذرائع رزق کو چشمۂ جاریہ کی طرح بہتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کیمطابق اس سے بہرہ یاب ہو سکے۔ لیکن لوگ — یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ — ان چیزوں کے آگے بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور یوں انسانیت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر دیندار ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ تو ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ اگر اپنے آپ کو نمازی کہتے ہیں تو ان کی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب ہیں۔ (۱۰۷) اور عذاب جہنم کا باعث۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹/۳۴) جو لوگ چاندی اور سونے کے سکے جمع کر رکھتے ہیں اور انہیں نوع انسان کی بہبود کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ (اے رسول!) ان کے لئے ایک الم انگیز عذاب کا اعلان کر دو — یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ۔ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹/۳۵) جس دن ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ سکے ہیں جنہیں تم نے صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر روک رکھا تھا۔ لہذا،

آج تم اس الم انگیز عذاب کا مزہ چکھو جو تمہاری غلط روش کا فطری نتیجہ ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے دولت کے روک رکھنے کے مقابلہ میں "انفاق" کا لفظ استعمال کیا ہے نَفَقٌ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے دونوں منہ کھلے ہوئے۔ اس سے دولت کے متعلق قرآن کریم کا نقطۂ نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بُخل کا لفظ ہے۔ یعنی دولت کو عالمگیر انسانیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اپنی ذات کے لئے روک رکھنا۔ جو قوم اپنے ہاں اس قسم کا معاشی نظام رائج کرے جس میں اس روش کو جرم نہ قرار دیا گیا ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ "اور اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی"۔ یعنے اس قوم کا معاشی نظام اس قسم کا نہیں ہوتا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رُو سے قوموں کے عروج و زوال میں ان کے معاشی نظام کا کس قدر بنیادی دخل ہے۔

## دولت کی گردش

اتنا ہی نہیں کہ دولت گردش میں رہے۔ بلکہ اس کی گردش ایسی ہو کہ وہ معاشرہ میں اس طرح رواں دواں رہے جس طرح جسم کی رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اوپر کے طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے ـــ كَيْ لَا دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹/۷)۔ "وہ تم میں سے امیروں کے گھروں میں ہی نہ پھرتی رہے"۔

## ربٰو

دولت کیوں جمع کی جاتی ہے؟ اسلئے کہ انسان کو محنت کر کے کمانا نہ پڑے۔ بلکہ دولت کمائی کا ذریعہ بن جائے۔ یہاں سے وہ سوال سامنے آتا ہے جو نظامِ معیشت کی اصل اور بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ معاوضہ محنت کا ہونا چاہیئے یا سرمایہ کا ـــ قرآن کریم اس باب میں کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے ـــ کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ (۵۳/۳۹) "انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے" معاوضہ محنت کا ہے سرمایہ کے معاوضہ کو وہ ربٰو سے تعبیر کرتا ہے ـــ ہمارے ہاں ربٰو کا ترجمہ عام طور پر "سود" کیا جاتا ہے اور اس سے پھر اس قسم کی بحثیں چھڑ جاتی ہیں کہ سود کس قسم کا جائز ہے اور کس قسم کا ناجائز۔ سوال سود کا نہیں، ربٰو کا ہے اور ربٰو کے معنے ہیں سرمایہ پر بڑھوتی ـــ خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے ـــ ربٰو ہے اور (بہ نصِ صریح) حرام ـــ (وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۲/۲۷۵)۔

چونکہ ایسا معاشی نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ جائز قرار دیا جائے قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نقیض ہے اس لئے قرآن کریم نے اسے اسلامی نظام کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔ (۲/۲۷۸)

# بیع (تجارت)

قرآن کریم نے کہا ہے۔ کہ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) — خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے۔ کہ بیع (تجارت) میں بھی تو سرمایہ پر منافع لیا جاتا ہے اس لئے یہ کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ اصول صحیح نہیں کہ قرآنی نظامِ معیشت میں خالی سرمایہ پر منافع جائز نہیں۔ یہ سوال آج کی ذہنیت کا پیدا کردہ نہیں۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں بھی ایسے لوگ تھے۔ جو اس ذہنیت کے حامل تھے اور کہتے تھے۔ کہ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ (۲/۲۷۵) — بیع (تجارت) بھی تو ربٰو ہی کی مثل ہے۔ پھر یہ کیوں ہے۔ کہ بیع حلال ہے — اور ربٰو حرام۔

اس سلسلہ میں، پہلے تو بیع کے لفظ پر غور کیجئے۔ یہ لفظ خریدنے اور فروخت کرنے، دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ یعنی ایسی شکل جس میں ایک شخص بیک وقت کچھ بیچتا ہے اور کچھ خریدتا ہے۔ یہ شکل (بارٹر سسٹم) ہی میں ممکن العمل ہے۔ اس میں ایک شخص اپنی ایک جنس بیچتا ہے اور اس کے بدلے میں دوسری جنس خریدتا ہے۔ اس سے ایک ہی سودے میں، دونوں طرف سے، خرید اور فروخت، عمل میں آجاتی ہے جب سکوں کے عوض کسی شے کو خریدا جائے تو خریدار، دوسرے کی شے کو خریدتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کچھ بیچتا نہیں۔ اسلئے بیع (بارٹر سسٹم) میں ربٰو (سرمایہ پر بڑھوتی) کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

اب رہی بیع (تجارت) کی موجودہ شکل جس میں کاروبار سکوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جب قرآنی معیشت کے یہ اصول واضح ہیں۔ کہ

(۱) معاوضہ محنت کا ہے۔ اور

(۲) خالی سرمایہ پر منافع حرام ہے۔

تو تجارت کی صرف وہ شکل جائز قرار پائے گی جس میں تاجر اپنی محنت کا معاوضہ لے سکے۔ جو سرمایہ اس نے لگایا ہے اس پر منافع نہ لے۔ یعنی اس میں اصول یہ ہو کہ

قیمت فروخت = لاگت + محنت کا معاوضہ

اور محنت کا معاوضہ، نظام مملکت کی طرف سے متعین ہو۔

## کاریگر اور دُکاندار

تجارت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کاریگر کوئی چیز بناتا ہے۔ دکاندار اسے خریدتا ہے اور پھر اپنے منافع کے ساتھ آگے بیچتا ہے۔ غلط نظامِ معیشت میں، دکاندار کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ کاریگر کو کم از کم دے اور گاہک سے زیادہ سے زیادہ لے۔ قرآن کریم نے اس ذہنیت کو فاسقانہ اور اس قسم کے نظام کو جس میں یہ روش عام ہو مجرمانہ قرار دیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ قوم کے لئے تباہی بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (۸۳:۱) تباہی ہے ایسے لوگوں کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ (۸۳:۲) جب وہ دوسروں سے لیں تو پورا پورا لیں۔ وَ اِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ (۸۳:۳) اور جب انہیں دیں تو ماپ اور تول میں کمی کر دیں۔

ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی عائد کردہ شرائط کو پورا کرنے کے لئے بیع کی وہ شکل زیادہ مناسب ہوگی جس میں اشیائے مستعملہ خود نظامِ مملکت کے زیرِ تحویل تیار ہوں اور وہی ان کی تقسیم کا انتظام کرے۔

## فاضلہ دولت

عزیزانِ من! میں نے جو کچھ اس وقت تک کہا ہے وہ ایک صحیح (قرآنی) نظامِ معاشی کے اصول و مبادیات ہیں۔ ورنہ قرآن کریم نے، ایک مختصر اور سادہ سے حکم سے، پورے نظامِ سرمایہ داری کو اس کی جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) — اگر افرادِ معاشرہ کے پاس فاضلہ دولت نہ رہے۔ تو نظامِ سرمایہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں سنیئے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت، دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلی رکھیں۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲:۲۱۹) — ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، سب کی سب۔ آپ نے غور کیا۔ کہ اس ایک حکم سے کس طرح نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

## ضروریات کا تعیّن کون کریگا؟

اس مقام پر ایک دلچسپ اعتراض سامنے لایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ان ضروریات کا تعیّن کون کریگا؟

اگر اسے لوگوں کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا۔ تو وہ اپنی ضروریات ہی اتنی بنائیں گے جن کے پورا ہونے کے بعد کچھ باقی نہ بچے۔ اور اگر ان ضروریات کا تعین حکومت کی طرف سے ہوگا۔ تو یہ زندگی، جیل خانے کے قیدیوں کی سی ہوگی جس میں ان کی ضروریات کا تعین جیل کے قواعد کی رُو سے ہوتا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ ہم نظام تو اسلام کا سامنے لاتے ہیں اور اس کا اطلاق اپنے آپ پر کرتے ہیں۔ جن کی حالت یہ ہے کہ ہمارا ذہن قرآنی اور نہ ماحول قرآنی۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے اصول و احکام، قرآنی ذہنیت و تصورات کے حامل افراد کے لئے ہیں۔ اور وہ قرآنی ماحول اور نظام کے اندر فٹ ہو سکتے ہیں اگر ہم ان کا اطلاق اپنے آپ پر کرنے لگیں گے۔ تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی ٹیڑھے پاؤں میں سیدھا جوتا پہنانے کی کوشش کی جائے۔ جن مسلمانوں نے اس نظام کو عملاً متشکل کیا تھا، ان کی ضروریات اور ضروریات کے تعین کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگایئے۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو سوال یہ پیدا ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ کیا مقرر کیا جائے۔ بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ یہ ہوا۔ کہ اُسے خود خلیفہ پر چھوڑ دیا جائے۔ کہ وہ اپنی ضروریات کیلئے کتنا وظیفہ کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا۔ کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم آمدنی کیا ہے۔ وہی آمدنی آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کی۔ جب پوچھا گیا کہ اس میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ اتنی آمدنی میں جس طرح اُس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے اسی طرح میرا گزارہ ہوگا۔ میں کوشش کروں گا۔ کہ اس مزدور کی آمدنی بڑھتی جائے تاکہ اس طرح میرے وظیفہ میں بھی اضافہ ہوتا جائے۔

اب رہا ضروریات کا تعین ــــ ایک دن کھانے کے بعد آپ نے بیوی سے کہا۔ کہ کوئی میٹھی چیز نہیں۔ اس لئے کہا۔ کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی ــــ بات آئی گئی ہوئی ــــ سات آٹھ روز کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ دسترخوان پر تھوڑا سا حلوہ بھی رکھا ہے۔ آپ نے اُسے کھایا۔ اور پھر پوچھا کہ یہ حلوہ آج کیسے بن گیا؟ بیوی نے کہا۔ کہ میں نے اُس دن آپ کی خواہش کو محسوس کر کے یہ کیا کہ ہر روز آٹا گوندھتے وقت ایک مٹھی بھر آٹا الگ رکھ لیتی تھی۔ سات آٹھ روز کے بعد وہ آٹا اتنا ہو گیا کہ بازار سے اس کے عوض تھوڑا سا شیرہ مل گیا۔ اس سے میں نے یہ حلوہ تیار کر لیا۔

آپ گھر سے نکلے اور سیدھے راشن ڈپو پر گئے اور مودی سے کہا کہ ہمارے ہاں جتنا آٹا ہر روز جاتا ہے۔ آئندہ اس سے ایک مٹھی بھر کم جائے گا۔ کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ مٹھی بھر کم آٹے میں بھی ہو جاتا ہے۔

یہ تھا معیار ان کا، اپنی ضروریات کے تعین کے لئے۔ اپنی ضروریات کا پورا کرنا۔ تو ایک طرف قرآن کریم

نے ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے۔ کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے ــــــ اس (دوسروں کو اپنے پر ترجیح دینے) کی کیفیت یہ تھی، کہ ایک دن مصر کا گورنر بابِ خلافت میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ امیرالمومنین (حضرت عمرؓ) زیتون کے تیل کے ساتھ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اب تو مصر سے کافی گیہوں آرہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے کہا کہ اس وقت مجھے یقین ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو جو کی روٹی مل جاتی ہے جس دن تم اس کا یقین دلاؤ گے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اُس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھاؤں گا۔

قرآن کا معاشی نظام، قلب و نظر میں کس قسم کی تبدیلی چاہتا ہے ــ اس نکتہ کے متعلق میں تفصیل سے ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اسلامی معاشرہ میں ضروریات کا تعین اس طرح ہوتا ہے۔

---

# حاصلِ بحث

اس وقت تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی۔ کہ قرآن کریم کے معاشی نظام کی رُو سے :-

(۱) تمام افرادِ مملکت کو ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا، مملکت کا فریضہ ــ بلکہ اس کی ہستی کی وجہ جواز ہے۔ ان بنیادی ضروریات میں کھانا، پینا، لباس، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ سب شامل ہیں انہیں اس طرح پورا کیا جائے گا۔ کہ ( REGIMENTION ) کے بجائے، افراد کے ذاتی ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہے۔

(۲) مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اُسی صورت میں عہدہ برا ہو سکتی ہے کہ ذرائع رزق اس کی تحویل میں رہیں۔ اس لئے قرآن کریم کی رُو سے، ذرائع رزق پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب نظامِ معاشرہ کے کنٹرول میں رہیں گے۔ ملکیت اس پر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔

(۳) ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے گا۔ اس سے مستثنیٰ وہی ہوں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ معذور ہوں۔ کام کی تقسیم، افراد کی صلاحیت اور امکانی استعداد کے

مطابق ہوگی۔

(۴) اگر ہم قرآن کے اصولوں کو دورِ حاضر کے معاشی تصورات کی روشنی میں سمجھنا چاہیں تو کہا جائے گا۔ کہ اس میں معاوضہ محنت کا ہوگا سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خالی سرمایہ پر ہر قسم کا منافع ممنوع ہوگا۔ فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے گی اور جب فاضلہ دولت ہی نہ ہوگی تو روپیہ جمع کرنے یا جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

## کمیونزم اور اسلام

میں یہ کہہ رہا ہوں، اور میری نگاہیں اس سوال کو بھانپ رہی ہیں جو آپ کے اُفقِ قلبی سے اُٹھ اُٹھ کر آپ کے ذہن کو متاثر کر رہا ہے۔ آپ کے دل میں سوال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہ تو پھر کمیونزم ہو گیا اس سوال کا جواب ضروری ہے اسے غور سے سنیئے:۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر قرآن کا معاشی نظام اور کمیونزم کا معاشی نظام ایک ہی ہیں یا ان دونوں میں مماثلت ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ دنیا کی کسی قوم نے اسلام کے معاشی نظام کو اپنا لیا ہے۔ قرآن کریم نے یہ نظام چودہ سو سال پہلے دیا تھا اور کمیونزم کا نظام بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اسلئے یہی کہا جائے گا۔ کہ کمیونزم نے یہ نظام اسلام سے لیا ہے نہ یہ کہ اسلام اس نظام کو کمیونزم سے مستعار لے رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے (اور مجھے اس کا اکثر تجربہ ہوتا رہتا ہے) کہ جو لوگ موافقاً یا مخالفاً کہتے ہیں کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہے، وہ نہ اسلام کو سمجھتے ہیں نہ کمیونزم کو۔ کمیونزم اس معاشی نظام ہی کا نام نہیں جو روس یا چین میں رائج ہے۔ کمیونزم ایک مخصوص فلسفۂ زندگی یا نظریۂ حیات ہے جس پر اسکے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کسی معاشی یا سیاسی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات ہے جس کی بنیادوں پر اسکے تمام نظام استوار ہوتے ہیں۔ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی یا نظریۂ حیات، اسلام کے فلسفۂ زندگی یا نظریۂ حیات کی یکسر نقیض ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وقت نہیں کہ میں آپ کو تفصیل سے بتا سکوں کہ اسلام کا فلسفۂ حیات کیا ہے اور کمیونزم کا فلسفۂ زندگی کیا۔ اس وقت میں ان کے صرف نمایاں اصولوں پر اکتفا کروں گا۔

کمیونزم کا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ

(۱) زندگی صرف یہی طبیعی زندگی ہے جو انسانوں اور حیوانوں دونوں میں مشترک ہے۔ انسان طبیعی

قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے اور انہیں کے مطابق اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ مر جاتا ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ایک حیوان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۲) دنیا میں ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے جب وہ اپنے شباب تک پہنچتا ہے تو اس پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک اور نظام برآمد ہونا شروع ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا جب پوچھا جائے کہ وہ کونسی قوت ہے جس سے یہ گردش دولابی اس طرح جاری ہے تو اسکے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب تاریخی وجوب ( HISTORICAL NECESSITY ) کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نظامِ سرمایہ داری کا دور تھا۔ اب اس کی جگہ اس کی ضد، اشتراکی نظام کی باری ہے (اس فلسفہ کی رُو سے، اشتراکی نظام کے بعد پھر نظام سرمایہ داری کا دور آجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی شکل سابقہ نظامِ سرمایہ داری سے قدرے مختلف ہوگی۔

(۳) اس نظام کی تشکیل اور انسانی زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق، ہر فیصلہ مملکت کی مصلحت کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کوئی ایسے مستقل اصول و اقدار نہیں جن کی پابندی ضروری ہو۔

(۴) اس فلسفہٴ زندگی کے ماننے والے، نہ خدا کے وجود کے قائل ہوتے ہیں نہ وحی کے، نہ (طبیعی جسم سے ماوراء) انسانی ذات ( HUMAN PERSONALITY ) کو تسلیم کرتے ہیں نہ حیاتِ آخرت کو۔ ان کے نزدیک

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے؟ — انہی اجزاء کا پریشان ہونا۔

اس کے برعکس قرآن کا عطا کردہ فلسفہٴ زندگی ہے جس کی رُو سے :

(۱) انسانی زندگی، محض طبیعی جسم کی زندگی کا نام نہیں۔ انسان میں، طبیعی جسم کے علاوہ، ایک اور شئے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) انسانی زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ نشوونما یافتہ ذات، فرد کی موت کے بعد زندہ رہتی ہے اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔

(۳) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو انسان کو وحی کی رُو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

(۴) چونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشوونما، جسم کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے

اس لئے، انسانی جسم کی پرورش نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک ایسا معاشی نظام دیا گیا ہے جس میں جسم انسان کی پرورش اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے کہ حصولِ رزق کی جدوجہد انسانی ذات کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ یہ اس کی نشوونما کے لئے ممد و معاون ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ یہ نظام، افرادِ معاشرہ کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے وقف کر سکیں۔ ان مقاصد کے حصول کی جدوجہد سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

## جذبۂ محرکہ

اس مقام پر شاید آپ کہہ دیں کہ کسی فلسفۂ زندگی کا معاشی نظام سے کیا تعلق ہے؟ اس کا تعلق بڑا گہرا ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انسان کا ہر عمل، اس کے جذبۂ محرکہ کا رہین ہوتا ہے۔ جذبۂ محرکہ کے بغیر عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ (۱) انسان کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے، (۲) اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ (۳) جب وہ خواہش، مستحکم اور شدید ہو جاتی ہے تو وہ ارادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کو جذبۂ محرکہ کہتے ہیں۔ اور (۴) جب یہ جذبہ، انسان کی طبیعی قوتوں کی رو سے محسوس شکل میں سامنے آتا ہے تو اسے انسان کا عمل کہا جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسان کے عمل کی بنیاد اس کے پیشِ نظر مقصد پر ہوتی ہے۔ اور مقصد کا تعین، وہ فلسفۂ حیات کرتا ہے جسے انسان بطور ایمان اپنے لئے اختیار کرتا ہے — "ایمان" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس فلسفۂ زندگی کو اس قدر سچا اور گراں بہا سمجھتا ہے کہ وہ اس کی خاطر ہر قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

یہ ہے فلسفۂ حیات (آئیڈیالوجی) کا تعلق معاشی نظام کے ساتھ۔ اب آپ پوچھیں گے کہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات میں وہ کیا خرابی ہے جس کی بنا پر اسے انسان کے معاشی نظام کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نکتہ بھی اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ صحیح معاشی نظام کی بنیاد اس اصل الاصول پر ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی (کم از کم) ضروریات کے بعد، جو کچھ فاضلہ ہو اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام کر دے۔ سوال یہ ہے کہ انسان ایسا کیوں کرے؟ وہ کیوں زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے اور اس محنت کے ماحصل کو دوسروں کے لئے عام کر دے؟ دوسرے یہ کہ اگر کسی انسان کو اس کا یقین ہو کہ اس کی بنیادی ضروریات بہر نوع پوری ہوتی رہیں گی تو وہ کام ہی کیوں کرے گا۔ اور اگر وہ کام کرے گا تو بڑی بے دلی سے کرے گا۔ جان مار کر کبھی نہیں کرے گا بالخصوص جبکہ اسے معلوم ہے کہ وہ اس کی زائد از ضروریات کمائی دوسرے لوگ لے جائیں گے — کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رو سے،

اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جو زیادہ کما سکتا ہے وہ اپنی فاضلہ کمائی ان لوگوں کو دیدے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تو خالص جذباتی دلیل ہے۔ اس کا تعلق کمیونزم کے فلسفۂ حیات سے کچھ نہیں۔ کمیونزم کا فلسفۂ حیات اس قسم کا جذبۂ محرکہ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فلسفۂ حیات کی وجہ سے، کمیونزم کے ساتھ ہو اکیا ہے؟ روس نے مظلوم و مقہور مزدوروں کو آواز دی کہ اٹھو! اور ان دولتمندوں کو لوٹ لو جو تمہاری محنت کی کمائی چھین کر لے جاتے ہیں۔ مزدور اٹھے اور انہوں نے ان دولتمندوں کو لوٹ کر انہیں ختم کر دیا۔ ان کا یہ عمل، انتقام کے جذبہ کی پیداوار تھا۔ جب دولتمند طبقہ باقی نہ رہا، تو مزدوروں کے دل میں جذبۂ انتقام بھی باقی نہ رہا۔ اور جب یہ جذبہ ہی باقی نہ رہا تو اس پہ اٹھی ہوئی عمارت کس طرح قائم رہتی؟ نتیجہ یہ کہ لینن کے زمانہ تک تو کمیونزم کا معاشی نظام چلا۔ اس کے بعد اسٹیلن کو، اسے چلانے کے لئے ڈنڈے کی ضرورت پڑی۔ لیکن ڈنڈے کے زور پہ کوئی نظام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اسٹیلن کے بعد، اس کی گاڑی رک گئی اور روس کو اس نظام میں خاصا رد و بدل کرنا پڑا۔ اس وقت چین اور روس میں جو نزاع چل رہی ہے وہ یہی ہے کہ روس میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا اور چین اس پہ مصر ہے کہ اسے اُس شکل میں باقی رکھا جائے۔ چین میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں اس لئے قائم ہے کہ اِس وقت ان کے ہاں، وہ پارٹی موجود ہے جس کے ہاتھوں یہ انقلاب عمل میں آیا تھا۔ اس اعتبار سے، چین اس وقت اُس مقام پر ہے جس مقام پر روس لینن کے زمانے تک تھا۔ جب چین کی موجودہ نسل کے بعد، اگلی نسل آئے گی تو ان کے سینوں میں بھی وہ جذبہ باقی نہیں رہے گا جو اس نظام کے قیام کے لئے اس قدر قربانی چاہتا ہے۔ اس وقت ہاں بھی پہلے اسٹیلن کے ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس کے بعد اس نظام کی گاڑی آگے چلنے سے رک جائے گی۔

یہ ہے بنیادی نقص، کمیونزم کے فلسفۂ حیات کا جس کی وجہ سے ان کا معاشی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔[1]

## اسلام کا فلسفۂ حیات

اس کے برعکس، اسلام کے فلسفۂ حیات کو لیجئے۔ میں نے بتایا ہے کہ اسلام کے فلسفۂ حیات کی رُو سے

---

[1] کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رُو سے جب یہ مان لیا جائے کہ سابقہ نظام سرمایہ داری کی جگہ اب تاریخی وجوب کی رُو سے) نظام اشتراکیت آکر رہنا ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ تو اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے کسی کوشش اور سعی و کاوش کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس نظام نے تو بہر حال آکر رہنا ہے خواہ اس کے لئے کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشو و نما ہے۔ اور یہ نشو و نما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہو سکتی ہے جو انسان کو وحی کی رو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۱۸) جو شخص اپنی کمائی دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدیتا ہے، اس کی ذات کی نشو و نما ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھئے کہ قرآن کے فلسفہ حیات کی رو سے:-

(۱) انسان زندگی کا مقصد ٹھیرا انسانی ذات کی نشو و نما۔۔۔ اور

(۲) انسانی ذات کی نشو و نما اس طرح ہوتی ہے کہ انسان پوری محنت سے کمائے اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بطیب خاطر دیدے۔

جس شخص کا اس فلسفہ حیات پر ایمان (یقین) ہو گا اس سے کام کرانے کے لئے نہ کسی ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی اس کی زائد کمائی کو اس سے زبردستی چھیننے کی حاجت۔ وہ خود اپنی ذات کی بھلائی کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا اور اس میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر باقی سب، اپنے دل کی کامل رضامندی سے دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے دیدیگا۔ یہ ہے کمیونزم کے فلسفہ حیات اور اسلام کے فلسفہ حیات کا اثر ان کے معاشی نظام پر۔ پروفیسر ہاٹرے (HAWTREY) نے لکھا ہے کہ

جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام پر آمادہ کرتا ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ (جزئیات میں اس قدر مماثلت کے باوجود) قرآن کا معاشی نظام کمیونزم کے معاشی نظام سے کس قدر متمیز ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کے پاس وہ بنیاد نہیں جس پر اس قدر عظیم عمارت قائم رہ سکے۔ اور قرآن کا معاشی نظام ایسی محکم بنیادوں پر استوار ہے کہ لَا انۡفِصَامَ لَهَا۔ وہ کبھی منہدم ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جس کی طرف، علامہ اقبالؒ نے روس کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی تھی۔ انہوں نے پہلے، کمیونزم کے فلسفہ حیات کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ

لا سلاطیں۔ لا کلیسا۔ لا الٰہ

یعنی ان کا جذبہ محرکہ سارے کا سارا تخریبی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب آپ کسی غلط نظام کہنہ کی جگہ دوسرا نظام لانا چاہیں گے تو آپ کو سب سے پہلے، اس نظام کو اوپر سے نیچے تک منہدم کرنا پڑے گا۔ یہ عمل یکسر تخریبی ہو گا۔ لیکن یہ اس پروگرام کی پہلی کڑی ہو گی۔ اس تخریب کے بعد تعمیر شروع ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ

در مقام لا نیاساید حیات سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا (تخریب) کے بعد الّا (تعمیر) لاینفک ہے۔ اگر الّا (تعمیر) نہ ہو تو زندگی کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے روس کو مخاطب کر کے کہا کہ

کردہ کار خداوندی تمام
بگذر از لا جانب الّا خرام

تو نے باطل کے ہر خدا کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ تو نے ملوکیت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا۔ تو نے نظام سرمایہ دار کا جنازہ نکال دیا۔ تو نے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا۔۔۔ تو نے یہ کچھ تو کر دیا۔۔۔ اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو تیرے ہاتھوں سرانجام پایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد، وہ مثبت بنیاد کونسی ہے جس پر تو اپنے نظامِ نو کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے!

یہ اساسِ محکم، جو نظام سرمایہ داری کی شکست و ریخت کے بعد، ایک صحیح معاشی نظام کی بنیاد بن سکنے کے قابل ہے، صرف قرآن کے عطا کردہ فلسفۂ حیات سے مل سکتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے، ۱۹۳۱ء میں، سر فرانسس ینگ　　کے نام، اپنے خط میں لکھا تھا کہ

BOLSHEVISM PLUS GOD IS ALMOST IDENTICAL WITH ISLAM

اگر بالشوزم کے ساتھ خدا کو شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے مماثل ہو جاتا ہے۔ "خدا شامل کرنے" سے انکی مراد یہی تھی کہ اس نظام کو خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انہیں امید تھی کہ روس جب اپنے جذباتی بحران سے نکل جائے گا تو اس "اساسِ محکم" کی تلاش ضرور کرے گا۔ لیکن روس نے اپنا مقام ہی چھوڑ دیا۔ اب وہی پوزیشن چین کی ہے۔ اس نے بھی ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ لیکن اس حصۂ لا کے بعد، حصۂ الّا اس کے پاس بھی نہیں۔ اے کاش! آج کوئی اقبالؔ، چین کو بتا سکے کہ وہ اساسِ محکم کونسی ہے جس پر اس کے نظام کی عمارت استوار ہو کتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ جو کچھ روس کے ساتھ ہوا ہے، وہی کچھ (ایک نسل کے بعد) چین کے ساتھ بھی ہوگا۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ دنیا کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ دنیا کی قسمت کے ستارے تو قرآن کے سراجاً منیراً ہی سے جگمگا سکتے ہیں۔

## ایک اعتراض

نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے (اور یہی اعتراض اس نظام کے حق میں

بطور دلیل محکم پیش کیا جاتا ہے) کہ ذاتی مفاد ہی وہ جذبہ محرکہ ہے جس کے ماتحت انسان محنت و مشقت کرتا ہے اگر اس جذبہ کو نکال دیا جائے تو کوئی شخص جان مار کر محنت نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو پیش کیا جاتا ہے اور پھر روس کی مثال دے کر کہا جاتا ہے کہ دیکھیے! اس جذبہ کو نکال دینے سے اشتراکی نظام کس طرح ناکام رہ گیا۔

یہ اعتراض کمیونزم کے فلسفۂ حیات کے پیش نظر واقعی بڑا وقیع ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے روس کے ناکام تجربہ نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اس فلسفہ کی رُو سے، انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ کوئی نہیں رہتا۔ لیکن قرآن کریم کی آئیڈیالوجی کے مطابق اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی --- یہ درست ہے کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور ذاتی مفاد ہی کام کے لئے جذبۂ محرکہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ انسان بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے۔ (مثلاً) انسان مال سے محبت رکھتا ہے اسے محنت سے کماتا اور بڑی احتیاط سے جمع کرتا ہے' لیکن جب وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اپنی جان بچانے کے لئے بے دریغ مال خرچ کر دیتا ہے (جو ایسا نہیں کرتا اس پر سب لعن طعن کرتے ہیں)۔ یہ اس لئے کہ اس کے نزدیک، اس کی جان کی قیمت، مال کی قیمت سے زیادہ ہے۔ وہ زیادہ قیمتی متاع کو بچانے کی خاطر، کم قیمت کی متاع صرف کر دیتا ہے۔

قرآنی آئیڈیالوجی کی رو سے، مال کی بھی ایک قیمت ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمت انسانی ذات کی ہے۔ لہٰذا، جب وہ اپنی ذات کے استحکام کی خاطر، مال دوسروں کو دیتا ہے تو وہ اپنے بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے اور اسے نفع کا سودا سمجھتا ہے۔ لہٰذا، اس فلسفۂ حیات کے مطابق، انسان اپنے فائدے کو چھوڑتا نہیں بلکہ کم فائدے کو چھوڑ کر، زیادہ فائدے کی طرف لپکتا ہے۔ اس لئے نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے جو اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رو سے تو واقعی نہیں مل سکتا۔ لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رُو سے اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ اور اس کا اعتراف تو خود اس نظام کے علمبردار بھی کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے مجسمے نصب اور ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں جنہوں نے بڑی محنت سے مال کمایا اور اسے نوع انسان کی بہبود کی خاطر وقف کر دیا۔ دنیا میں آج تک کسی شخص یا کسی قوم نے کسی ایسے آدمی کی یادگار قائم نہیں کی جس نے کروڑوں روپے کمائے لیکن اس دولت کو اپنی یا اپنی اولاد کے لئے مخصوص رکھا اور اسی حالت میں مر گیا۔ دنیا نے ایسے افراد پر ہمیشہ لعنت بھیجی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے بقا اور دوام کا اصول یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

دنیا میں باقی وہی رہتا ہے جو عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔

دیگر اقوام میں اس قسم کے افراد مستثنیات میں سے ہوتے ہیں، قرآن کریم ہر مومن کو اسی خصوصیت کا حامل بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے جس کی ممبرشپ (رکنیت) کی اولیں شرط وہ معاہدہ ہے جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے یعنی — إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔ وہ عہد کرتا ہے کہ میں نے اپنا مال حتیٰ کہ اپنی جان، اس نظام کے ہاتھوں فروخت کر دی ہے جو نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہوا ہے۔ اس معاہدہ کے بعد ایک شخص، اسلامک سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے۔ اسے مسلمان کہتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان کی تو کوئی شے بھی ذاتی ملکیت کی نہیں ہوتی۔ وہ دن رات محنت کرتا ہے اور اس کے ماحصل کو اس نظام خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے۔ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور عندالضرورت اپنی جان تک بھی اس مقصد عظیم کی خاطر قربان کر دیتا ہے — يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (۹/۱۱۱) وہ "خدا کی راہ" میں جنگ کرنے کی خاطر سربکف میدان میں نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا میدان میں سر دیدیتے ہیں۔ یوں وہ ایک بڑے فائدے کی خاطر کم فائدے کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس معاشی نظام کو قائم کرتی ہے جس کی تفاصیل میں نے (قرآن کریم کی آیات کی روسے) آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ اس قسم کا نظام، یہی سوسائٹی قائم کر سکتی ہے۔ اس سوسائٹی نے (عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ) میں اس نظام کو قائم کر کے دکھا دیا۔

اور یہی ہے وہ نظام جو دنیا میں آخرالامر قائم ہو کر رہے گا خواہ ملوکیت۔ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی قوتیں اس کے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیدا کریں۔ قرآن کریم کو قیامت تک محفوظ ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ اسے نوع انسان کا عالمگیر ضابطہ حیات بننا ہے۔ جس قوم نے بھی اسے اپنا ضابطۂ حیات بنا لیا' اس کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا۔

واضح رہے کہ قرآن کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں۔ اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے یوگوسلاویہ کے مشہور اشتراکی، ڈاکٹر جیلاس (جسے اسی اختلاف کی بنا پر وہاں کے اشتراکیوں نے قید کر دیا تھا) ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> تاریخ میں کسی ایسے مثالی معاشرہ کی مثال نہیں ملتی جو غیر مثالی اور غیر فطری طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے غلاموں نے کبھی کوئی آزاد معاشرہ قائم نہیں کیا۔ نصب العین کی عظمت

اور حقیقت کا اظہار صرف اس سے ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لئے طریقے کیا اختیار کئے گئے ہیں۔

آپ قرآن کریم پر غور کیجئے۔ وہ "صحیح راستہ" کا سراغ دیتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ ہدایت یعنی "راہ نمائی" عطا کرتا ہے۔ وہ سبیل اللہ (خدا کی طرف لے جانے والے راستہ) کو اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ کہ جس نے صحیح راستہ اختیار کرلیا وہ صحیح منزل تک ضرور پہنچ جائے گا۔ لیکن جب راستہ ہی غلط ہو تو پھر صحیح منزل کیسے سامنے آئے گی؟

یہ ہے عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کا معاشی نظام۔

# سوالات

(خطاب کے بعد، سامعین کی طرف سے بعض نکات کی وضاحت کے لئے کچھ سوالات کئے گئے۔ ان میں سے دو ایک سوالات کے جواب تو اُسی وقت دیدیئے گئے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے باقی دعدہ فردا پر رکھ دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں۔ ان سے نفسِ مضمون کے ضروری مقامات کی تشریح ہوجاتی ہے۔)

## پہلا سوال ——— اقوامِ مغرب

آپ نے کہا ہے کہ جس کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور پستی کی ہوگی اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس کی اِس دنیا کی زندگی خوش حالی کی ہوگی وہ عاقبت میں بھی سرخرو ہوگا۔ اقوامِ مغرب کی اس دنیا کی زندگی بڑی خوش حالی کی زندگی ہے۔ کیا وہ آخرت میں جنت میں جائیں گی؟

## جواب

میرے عزیز! میں نے جو کچھ کہا ہے اور آپ نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ میں کہتا ہوں کہ جو طالب العلم اپنی کلاس (ATTEND) نہیں کرے گا وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس پر آپ کہتے ہیں کہ (اس کے یہ معنی ہوئے کہ) جو طالب العلم کلاس میں حاضر رہے گا وہ امتحان میں کامیاب ہوجائے گا ——— آپ نے غور کیا کہ آپ کا یہ نتیجہ کس قدر غلط ہے ——— جو طالب العلم کلاس میں حاضر ہوگا اسے امتحان میں کامیابی کے لئے کچھ اور بھی کرنا ہوگا ——— جو کچھ پڑھایا جائے اسے غور و فکر سے سننا اور سمجھنا۔ اسے یاد رکھنا۔ اس کے اظہار کی قابلیت پیدا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جو طالب العلم ان تمام شرائط کو پورا کرے گا وہ امتحان

میں کامیاب ہوگا، نہ کہ وہ طالب العلم جو کلاس میں حاضر تو رہے لیکن دیگر شرائط کو پورا نہ کرے۔

دین وہ پروگرام دیتا ہے جس سے انسان کی اس دنیا کی زندگی کامیابی و کامرانی کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی سرفرازی و سرخروئی کی زندگی۔ اگر ایک فقرہ میں کہنا چاہیں تو اس کا پروگرام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے اس دنیا کی زندگی مرفہ الحالی کی زندگی ہو جاتی ہے۔ اور ان قوتوں کے ماحصل کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے سے عاقبت سنور جاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دنیا میں تین قسم کی قومیں ملیں گی۔

(۱) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرے۔ اس قوم کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ ہوگی اور عاقبت بھی تابندہ۔ اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔

(۲) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کرلے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہ کرے۔ اس قوم کو اس دنیا میں مرفہ الحالی نصیب ہو جائے گی لیکن اس کی عاقبت تاریک رہے گی۔ اور

(۳) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اس سے اس کی اس دنیا کی زندگی پستی اور ذلت کی ہوگی۔ اور جب وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی۔ اس سے اس کی اس دنیا کی زندگی پستی اور ذلت کی ہوگی۔ اور جب وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی تو ان قوتوں کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے اس قوم کا آخرت کی زندگی میں کیا حصہ ہو سکتا ہے؟ یہ قوم کونسی ہے، اس کے متعلق آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

## دوسرا سوال — مغرب کے خدا پرست

مغرب کی جمہوری قومیں خدا پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور روس اور چین کے کمیونسٹ خدا کے منکر (دھریئے) ہیں۔ آپ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے ان دونوں میں سے کسے ترجیح دیں گے۔

## جواب

جہاں تک قرآنی نقطۂ نگاہ سے خدا کو ماننے کا تعلق ہے، مغرب کے مزعومہ خدا پرست اور روس اور چین کے دھریئے، دونوں ایک جیسے ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس کی متعین کردہ اقدار، اصول و احکام کو اپنے معاملات کے فیصلوں کا معیار اور حکم بنایا جائے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ اس کے نزدیک خدا پرست نہیں کافر ہے۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق (زندگی کے معاملات کے) فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ کافر ہیں۔

لہذا، قرآنی فلسفۂ زندگی کے مطابق، مغرب کی قوموں اور روس اور چین میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ جہاں تک ان کے معاشی نظام کا تعلق ہے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نقیض ہے اور اشتراکی نظام قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے ـــ اشتراکی نظام میں اگر (بقول اقبالؒ) خدا شامل کر لیا جائے تو اسلامی نظام ہو سکتا ہے۔ لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں خدا کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔

یہ انسانیت کی بدقسمتی تھی کہ کارل مارکس کے سامنے جو خدا آیا وہ مذہبی پیشوائیت کا تراشیدہ خدا تھا۔ اس خدا کا تصور واقعی نظام ملوکیت و سرمایہ داری کا پیدا کردہ اور عوام کے لئے "افیون" تھا۔ وہ اس خدا سے انکار نہ کرتا تو کیا کرتا؟ اگر اس کے سامنے کہیں قرآن کے پیش کردہ خدا کا تصور ہوتا تو وہ اسے اپنا ہادی و مرشد مانتا۔ مارکس زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ذرائع پیداوار ہرگز کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ اور قرآن کے خدا کا اعلان ہے کہ کائنات کی کسی شے پر بھی کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ سوچئے کہ اس خدا کو ماننے والے سے بڑا "کمیونسٹ" اور کون ہو سکتا ہے۔ کارل مارکس درحقیقت اس مذہبی پیشوائیت کا انکار کرنا چاہتا تھا جس کے ہاتھوں انسانیت استقدر زار و نالاں تھی۔ لیکن چونکہ مذہبی پیشوائیت اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ قرار دیتی تھی اس لئے اُسے اس خدا سے بھی انکار کرنا پڑا۔ اس کے دلِ دردمند کی یہی وہ ذہنی لغزش تھی جس کی بنا پر اقبالؒ اسے کبھی "پیغمبر بے جبرئیل" کہتا ہے اور کبھی "قلب او مومن دماغش کافر است" سے تعبیر کرتا ہے (جاوید نامہ صفحہ ۹۶)۔ کبھی اسے "کلیم بے تجلی" کہتا ہے اور کبھی "مسیح بے صلیب" ـ اور ـــ "نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب" ـــ سے اس کے نظام کی تعریف اور اس کے فلسفہ کی تردید کرتا ہے۔ (ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۱۹)۔ مغرب کی سرمایہ پرست قوموں نے اس کی اس اجتہادی غلطی سے فائدہ اٹھایا اور "دنیا کے خدا پرستو! اکٹھے ہو جاؤ" کے نعرے سے، اشتراکیت کی مخالفت کے لئے ایک "مقدس متحدہ محاذ" قائم کر لیا اور اس کا ہراول دستہ خود مسلمانوں کو بنایا ـــ ان مسلمانوں کو جن کا دین، سرمایہ پرستی کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ ہے مغرب کی وہ ابلیسی سیاست جو خدا کا نقاب اوڑھ کر وجۂ فریب عالم بن رہی ہے اور بھولا بھالا (بلکہ یوں کہئے کہ خود فراموش) مسلمان، اس کا سب سے پہلا شکار ہو رہا ہے۔

## تیسرا سوال۔ مسلمانوں کے ہاں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوئی

آپ نے کہا ہے کہ عہدِ نبی کریمؐ اور صحابہؓ میں قرآن کا یہ معاشی نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی گاڑی اس پٹڑی سے ہٹ گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ان کے ہاں در آیا۔ یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟

## جواب

یہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی ـــ واضح رہے کہ ملوکیت کے معنی وراثتی بادشاہت ہی نہیں۔ اسلام کی رُو سے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کا حق

صرف خدا کو ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی طرف سے قوانین مرتب کر کے ان کی اطاعت دوسروں سے کرائے۔ انسانوں کی اطاعت کے لئے قوانین و اقدار خدا نے مقرر کر دی ہیں۔ حکومت اس ایجنسی کا نام ہے جو ان قوانین کو دنیا میں نافذ کرتی ہے۔ اس ایجنسی کو "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملوکیت اس انداز حکومت کو کہتے ہیں جس میں انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے — اسلام نے ملوکیت کو مٹایا اور اس کی جگہ خدا کی حکومت کو قائم کیا تھا۔ خدا کی حکومت میں نظام سرمایہ داری بار ہی نہیں پا سکتا۔ اسی لئے تو ابوجہل نے اپنے خداؤں کے ہاں فریاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ — خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است — (جاوید نامہ)

جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی تو اس کا فطری نتیجہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کا نظام تھا۔ ملوکیت، عالمگیر انسانیت کے مفاد کا نہیں بلکہ ایک خاص گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتی ہے — لیکن اتنی بڑی تبدیلی "خدائی سند" کے بغیر کیسے پیدا کی جا سکتی تھی؟۔ یہ خدائی سند مذہبی پیشوائیت نے اپنی خود تراشیدہ شریعت کی رو سے بہم پہنچا دی — ملوکیت۔ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آرہا ہے۔ اسی لئے تو قرآن کریم نے قارون اور ہامان کو بھی ایک ہی صف میں کھڑا کیا ہے — وہ دن اور آج کا دن — ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، اسلام کے اقنوم ثلاثہ بنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جو آج اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے بہ نص صریح دولت جمع کرنے کو جہنم کا عذاب بنایا۔ رسول اللہ ﷺ نے تمام عمر ایک پائی بھی جمع نہ کی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت حضورؐ کو معلوم ہوا کہ گھر میں کہیں سے سات دینار آئے ہیں۔ آپ نے انہیں اسی وقت بیت المال میں بھجوا دیا یہ فرماتے ہوئے کہ میں خدا کے سامنے اس حالت میں نہیں جانا چاہتا کہ میرے گھر میں چاندی اور سونے کے ٹکڑے ہوں — یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسولؐ نے عمل کر کے دکھایا۔ لیکن اب ان حضرات کی طرف سے جو اسلام پیش کیا جاتا ہے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ

> جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس کے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء۔ مکانات۔ سواری۔ غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔[1]

حالت اب یہ ہے کہ یہ حضرات اسے تو بہ شد و مد بیان کریں گے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا خلاف سنت ہے لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ گھر میں چاندی سونے کے سکے جمع رکھنا خلاف حکم خداوندی اور خلاف سنت رسول اللہ ہے۔ یہ اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ نکال دینے کے بعد باقی کروڑوں روپوں کو پاک اور صاف قرار دیدیں گے لیکن

---

[1] "مسئلہ ملکیت زمین" از سید ابوالاعلیٰ مودودی (صفحہ ۵۲)

اسے کبھی نہیں بیان کریں گے کہ رسول اللہؐ نے ساری عمر زکوٰۃ ادا نہیں کی کیونکہ آپؐ نے کبھی روپیہ جمع ہی نہیں کیا تھا۔ یہ حضرات اس اہم مسئلہ پر تو گھنٹوں بحث کریں گے کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے حصّہ نہیں مل سکتا۔ (کیونکہ وہ یتیم ہے!!) لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ حضور نبی اکرمؐ نے خود کوئی ترکہ کیوں نہیں چھوڑا تھا اور جو اشیائے مستعملہ چھوڑی تھیں اس کے متعلق یہ کیوں فرمایا تھا کہ کسی کو وراثت میں نہیں مل سکتیں۔ اس کے لئے یہ حضراتؐ کہہ دیتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ ہم گروہ انبیاءؑ کا ترکہ وراثت میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ گویا ان حضرات کے نزدیک حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے اسلام کوئی اور ہوتا تھا اور ان کی اُمت کے لئے کوئی اور[1]۔ (یا للعجب!) یہ حضرات سرقہ (چوری) کے نصاب کے متعلق تو پہروں گفتگو فرمائیں گے لیکن یہ نہیں بتائیں گے کہ حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو چوری کا مجرم کیوں قرار نہیں دیا تھا جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کی چیزوں کی چوری کی تھی اور ان کی جگہ ان کے مالک کو یہ کہہ کر سزا دی تھی کہ تم نے انہیں بھوکا کیوں رکھا جس کی وجہ سے یہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ اس لئے نہیں بتائیں گے کہ اس سے ان کے پیش کردہ معاشی نظام (سرمایہ داری) کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے۔

وہ تھا اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسولؐ اور حضورؐ کے متبعین نے عمل کر کے دکھایا۔ اور یہ ہے وہ اسلام جو ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔

## چوتھا سوال — ترکہ۔ صدقہ۔ زکوٰۃ کے احکام

لیکن قرآن مجید میں صدقہ۔ وراثت۔ زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھی تو ہیں۔ اگر روپیہ جمع نہیں کیا جا سکتا تو ان احکام کے معنی کیا ہوں گے؟

## جواب

جس طرح اسلامی مملکت کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ بتدریج عمل میں آئی تھی۔ اسی طرح اس کا معاشی نظام بھی شب باشب وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔ اسے بھی بتدریج ہی عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ قرآن کریم نے اسی تدریجی پروگرام کے مطابق اپنے احکام دیئے ہیں۔ صدقہ۔ وراثت وغیرہ احکام، اُس دور سے متعلق ہیں جب یہ نظام ہنوز اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا تھا لیکن اسے بتدریج عمل میں لایا جا رہا تھا۔ ان احکام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کی رُو سے بھی ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے جو قرآنی نظام کا منتہیٰ ہے — یعنی ان کی رُو سے دولت، افراد کے ہاں مرتکز رہنے کے بجائے معاشرہ میں بکھرتی جاتی ہے۔ عبوری دور میں یہ احکام نافذ العمل رہتے تا آنکہ یہ نظام قائم ہو گیا جس میں یہ کہہ دیا گیا کہ — یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (۲/۲۱۹)۔ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ واضح رہے کہ رسولؐ اپنی امت کو بتدریج اس منتہیٰ کی طرف لاتا ہے لیکن اس کی اپنی زندگی شروع ہی سے اس آئیڈیل (منتہیٰ) کے مطابق ہوتی ہے تاکہ وہ لوگوں کے لئے نمونہ بنے۔ یہ وجہ ہے کہ حضورؐ نے ساری عمر نہ مال جمع کیا۔ نہ کوئی جائیداد بنائی۔ اور اس لئے نہ ہی کچھ ترکہ میں چھوڑا (بجز چند مستعملہ اشیاء کے)، اور ان کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ وراثت میں تقسیم نہیں ہوں گی۔ حضورؐ کا یہ فیصلہ اپنی ذات (یا صرف انبیاء کرامؑ) کے لئے نہیں تھا۔ یہ قرآن کے پیش کردہ مثالی معاشرہ کا آئینہ دار تھا جس تک دوسروں کو بتدریج پہنچنا تھا۔

جب ملوکیت آ گئی تو اسلام کا معاشی نظام نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا اور یہ عبوری دور کے احکام مستقل احکام بنا دیئے گئے۔ اب یہی احکام ہماری شریعت ہیں — یعنی سفر بلا منزل۔

---

[1] قرآن کریم میں بعض احکام کے متعلق یہ آیا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی ذات کیلئے مخصوص تھے (جیسے حضورؐ کی ازدواجی معاملات کے ساتھ کسی اور کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا) لیکن معاشی نظام کے سلسلہ میں کوئی ایسا حکم نہیں جسے حضورؐ کی ذات کے لئے مخصوص کیا گیا ہو۔

ابو شہاب

# اسلامی قانون کی تشکیل جدید

یہ فیصلہ شدہ امر ہے کہ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر عالم وجود میں آیا ہے۔ اس لئے جلد، یا بدیر یہاں پر اسلامی قوانین ہی رائج ہوں گے۔ پچھلے اٹھارہ سال سے ایک خاص طبقہ اپنے آپ کو اس کا خصوصی علمبردار سمجھتا ہے۔ اور عامۃ الناس کو یہ باور کرانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ اس کی ساری تگ ودو اسی مقصد کے لئے وقف ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلہ میں ابھی تک اس ابتدائی اور بنیادی سوال کے متعلق بھی کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا گیا۔ کہ یہ قانون کس بنیاد پر بنائے جائیں گے۔ کبھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ قانون سازی کتاب و سنت کے مطابق ہو۔ اور اگر کوئی ایسا قانون بنا دیا جاتا ہے جو خود ان کی اپنی تصریحات کے مطابق کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ تو پھر ایک نیا نعرہ لگا دیا جاتا ہے کہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہے۔ اور اگر حنفی فقہ کے مطابق ہو تو پھر کوئی اور اعتراض وارد کر دیا جاتا ہے۔ ان حضرات کے اس طرز عمل کو جس کی تفصیلات آپ کو آئندہ صفحات میں ملیں گی، اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ہر صحیح الفکر انسان اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اسلامی قانون کی تدوین اور اس کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ حضرات خود ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اگر دیانتداری سے اس کام کی تکمیل چاہتے ہیں تو انہیں واضح اور دو ٹوک الفاظ میں متفقہ بنیاد کے متعلق فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس بنیاد کے فیصلہ ہو جانے کے بعد بہت سے ایسے لوگ جنہیں اسلامی قانون سے دلچسپی ہے، تھوڑی سی مدت میں اپنے مجموعے تیار کر کے عوام کے سامنے پیش کر دیں گے۔

## تدوینِ جدید کی ضرورت

اسلامی قانون کی تدوین جدید کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق خود ان ہی کی زبانی سنیئے۔ ماہنامہ چراغ راہ کراچی کے اسلامی قانون نمبر جلد دوم کے صفحہ اول پر ہمیں مودودی صاحب کا یہ پیغام

ملتا ہے :-

" موجودہ دور میں اسلامی ریاست کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اسلامی قانون کی تدوین جدید ہے جس کے بغیر اول تو یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اور ہو بھی جائے تو وقت کے اہم مسائل سے ٹکرا کر خواب پریشان ہو جائے گا۔ آج اسلامی نظام کے حامیوں کے لئے زمانہ پھر ولیسا ہی چیلنج سامنے لے آیا ہے جیسا پہلی اور دوسری صدی ہجری میں دنیا کے بہت سے متمدن ممالک پر اسلام کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد وہ لیکر آیا تھا "

اسلامی قانون کی یہ تدوین جدید کن خطوط پر ہونی چاہیئے اسی رسالہ میں تھوڑا آگے چل کر ان کے اس وقت کے دستِ راست مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اس عقدہ کو حل فرماتے ہیں آپ اس طریقہ کو پسند فرماتے ہیں جو مصر میں اسی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ فرماتے ہیں:-

" آخر میں ایک کمیٹی مراغی مرحوم کی صدارت میں قائم ہوئی تھی جس کے ارکان میں مفتی شیخ عبدالمجید سلیم اور مصر کے چیف جسٹس فتح اللہ سلیمان بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لاز سے متعلق قوانین نئے طریقے پر مرتب کرائے اور اس میں کسی ایک متعین فقہ کی تقلید کی بجائے اسلام کے تمام فقہی مذاہب سے فائدہ اٹھائے یہ کمیٹی ہمارے نزدیک صحیح اصول پر ایک صحیح مقصد کے لئے بنائی گئی تھی"[1]

اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی وہ دن دکھایا جب ہمارے ملک میں مذکورہ بالا اصولوں کے عین مطابق عائلی قوانین بنائے گئے۔ یہاں زیادہ تفصیلات میں جانے کی تو ضرورت نہیں۔ انہیں عائلی قوانین میں سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے جو خود ان حضرات کی انہی تصریحات کے مطابق بھی کتاب و سنت کے مطابق تھی یعنے طلاق بدعت کا خاتمہ۔ یہ ایک ایسی برائی تھی جو ہمارے معاشرہ کو ایک لمبے عرصے سے تباہ کر رہی تھی۔ دوسرے علماء کی طرح مولانا مودودی صاحب بھی اسے ختم کرانے کی کوشش فرماتے رہے۔ اپنی قابل قدر تصنیف "حقوق الزوجین" میں فرماتے ہیں :-

" بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت تھی۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ

---

[1] چراغِ راہ۔ اسلامی قانون نمبر جلد ۲ صفحہ ۹۶-۳۲

ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظہ کے حکم ہیں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضور غصہ میں آکر کھڑے ہوگئے اور فرمایا۔ اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنَا بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ۔ (کیا اللہ عزو جل کی کتاب سے کھیل کھیلا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں) بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے اس فعل کو معصیت فرمایا اور حضرت عمرؓ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلس واحدہ میں تین طلاقیں دینے والا آتا تو وہ اس کو درے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا دی جا سکتی ہے۔

ہمارے زمانے میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو جھٹ تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے۔ کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابقہ تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ [۲]

ہم نے مولانا کا نقطۂ نظر پوری تفصیل سے نقل کر دیا ہے۔ اس ساری بحث سے مولانا کیا چاہتے ہیں؟ یہی نا کہ طلاق بدعت یعنی طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا ہر صورت میں خاتمہ ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ لیکن ہم حیران رہ گئے کہ جب اس برائی کو قانوناً ختم کیا گیا تو مولانا نے اس اقدام کی مخالفت کرنی شروع کر دی اور حنفی ائمہ کے علم و تقویٰ کا واسطہ دے کر اس بدعت اور معصیت کو

---

[۲] حقوق الزوجین از مولانا مودودی صاحب طبع ششم صفحہ ۱۵۴ - ۱۵۵

ایک دفعہ پھر سینے سے لگا لیا گیا۔ اور فرمانے لگے۔

"بلا شبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے۔ اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدت عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے جب تک کہ اس کی تحلیل نہ ہو جائے۔ اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مذہب حنفی کے ائمہ و فقہا کے علم و تقویٰ پر ہے وہ آج کل کے قانون سازوں پر نہیں ہے" [1]

جس چیز کے معصیت اور بدعت ہونے پر امت کا اجماع تھا اب وہ یکایک حنفی مذہب کے عین مطابق ہو گئی۔ اس اعتراض میں سب سے بڑی غلط بیانی تو یہ ہے کہ جس چیز کو حنفی مذہب کے خلاف کہا جا رہا ہے۔ وہ حنفی مذہب میں طلاق دینے کا احسن طریقہ ہے اور جسے اب حنفی مذہب کے ائمہ کے تقویٰ و علم کا واسطہ دے کر عین حنفی مذہب کہا جا رہا ہے ان کے نزدیک وہ بلا کسی شک و شبہ کے معصیت اور حرام ہے جیسا کہ پہلے مولانا کا خیال تھا۔ حنفیہ کا مسلک ملاحظہ ہو۔

وطلاق البدعة ان یطلقها ثلاثًا بکلمة واحدة او ثلاثًا فی طهر واحد وهو حرام عندنا و لکنه اذا فعل وقع الطلاق وبانت منه وحرمت حرمة غلیظة وکان عاصیًا [2]

ایک دفعہ تین طلاق کہہ دینا یا ایک طہر کی حالت میں تین طلاق دے دینا طلاقِ بدعت ہے اور یہ حنفی مذہب میں حرام ہے۔ لیکن جو ایسی طلاق کا مرتکب ہوگا تو اس کی بیوی جدا اور اس پر حرام ہو جائے گی۔ اور وہ معصیتِ الٰہی کا مرتکب ہوگا۔

یہ حضرات حنفی مذہب والی بات بھی دیانت داری سے کہہ دیتے۔ تب بھی اسلامی قانون کی تدوین کا کام آسان ہو جاتا لیکن جیسا کہ ہم نے ان کی غلط بیانی کی طرف اشارہ کیا ہے معلوم ہوتا ہے دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس کی وضاحت ان کے اپنے طرزِ عمل سے بھی ہو جاتی ہے۔ جو حنفی فقہ کے دوسرے مسائل کی بابت انہوں نے اختیار کیا ہے۔ انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ

---

[1] عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحہ ۱۸ - ۱۹، [2] شرح العنایہ علی الہدایہ جلد ۳ صفحہ ۲۴۔

خاندانی منصوبہ بندی کا ہے جو جزئیات کی حد تک حنفی فقہ کے عین مطابق ہے لیکن جس طرح یہ حضرات اس مسئلہ کو جائز سمجھنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اس کی جھلک اس مسئلہ کی تفصیلات نقل کرنے کے بعد دکھلائی جائے گی۔

## حنفی ائمہ اور ضبطِ ولادت

پہلے یہ دیکھئے کہ امام ابوحنیفہ اور دوسرے حنفی ائمہ جن کے تقوے اور علم کا واسطہ دیا جاتا ہے وہ ضبطِ ولادت کے متعلق کیا فتوے دیتے ہیں۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب شامی میں ہے:۔

وفی القھسانی اَنّ لِلسیّدِ العَزْل عَنْ امتہ بلا خلافٍ وکذا الزوج الحرۃِ باذنِہا وَ فی الفتاوی اِنْ خاف مِنَ الولدِ السُّوءِ فی الحرۃِ یَسَعہ العَزْل بغیرِ رضاھا لفسادِ الزمانِ۔ [۵]

(ترجمہ) قہستانی میں ہے کہ آقا لونڈی سے اُس کی اجازت کے بغیر عزل کر سکتا ہے، اس طرح خاوند اپنی آزاد عورت سے اس کی اجازت سے۔ لیکن فتاوے میں ہے، کہ اگر آزاد عورت سے ناقص اولاد کا خدشہ ہو تو پھر فسادِ زمانہ کی وجہ سے عزل کے لئے آزاد عورت کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں؛

سلف صالحین خاندانی منصوبہ بندی کے لئے عام طور پر عزل کی اصطلاح استعمال کرتے تھے اس کے معنے خاندانی منصوبہ بندی کے ہی ایک مشہور مخالف مفتی محمد شفیع صاحب کی زبانی سنیئے:۔

"اس کی جو صورت اس زمانے میں معروف تھی اسے عزل کہا جاتا ہے۔ یعنے ایسی صورت اختیار کرنا جس سے مادہ تولید رحم میں نہ پہنچنے پائے۔ خواہ مرد کوئی صورت اختیار کرے یا عورت فمِ رحم کو بند کرنے کی کوئی تدبیر نکالے۔" [۶]

مفتی صاحب نے یہ تشریح کوئی اپنی طرف سے پیش نہیں کی بلکہ ہمارے فقہاء کرام ہی ایسا فرما گئے ہیں۔ ایک دو عبارتیں ملاحظہ ہوں:۔

---

[۵] شامی۔ علامہ ابن عابدین جلد ۲ صفحہ ۴۱۱

[۶] ضبطِ ولادت عقلی اور شرعی حیثیت سے، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی صفحہ ۳۱

حکم العزل ھذا یجری علی استعمال دواء لمنع الحمل موقتاً ویجری علی اسقاط النطفۃ قبل النفخ الروح فیھا۔ فان الحکمۃ فی الکل واحدۃ وھی منع الحمل واللہ اعلم۔ [۷]

(ترجمہ) عزل کے حکم میں حمل روکنے کی دوائیں اور نفخ روح سے پہلے یعنے چار ماہ کا حمل بھی گرا دینا شامل ہے۔ کیونکہ ان تمام میں ایک ہی حکمت ہے، اور یہ حمل کا روکنا ہے اور اللہ تعالےٰ ہی صحیح جاننے والے ہیں؛

بخاری شریف کے مشہور حنفی شارح علامہ عینی نے عزل کی یہ تعریف فرمائی ہے۔

عزل الرجل ذکرہ عن الفرج لینزل منہ خارج الفرج فراراً لمن الاحبال۔ [۸]

(ترجمہ) عزل حمل سے بچنے کے ہر طریقہ کا نام ہے۔

ان تشریحات کے نقل کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ عامۃ الناس کی دینی کم علمی کیوجہ سے عزل کی اصطلاح کو عجیب عجیب من مانے معانی پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

عزل یعنے خاندانی منصوبہ بندی کی تائید میں بیشمار احادیث موجود ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ نے تو اسے قرآن مجید سے ہی ثابت کیا ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں۔

"وقد روی عن ابن عمر فی قولہ (نساؤکم حرث لکم) قال کیف شئت ان شئت عزلاً او غیر عزل رواہ ابوحنیفۃ عن کثیر الریاح الاصم عن ابن عمر [۹]

(ترجمہ) حرث (کھیتی) کی تفسیر میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ چاہے عزل کرو یا نہ کرو۔ امام ابوحنیفہؒ نے کثیر الاصم سے یہی روایت کیا ہے؛

آپ کہیں یہ خیال نہ کر بیٹھیں کہ خاندانی منصوبہ بندی صرف حنفی ائمہ کے نزدیک ہی جائز ہے۔ اس پر تو مذاہب اربعہ کے ائمہ کا مکمل اتفاق ہے۔ ہم نے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک صرف اس لئے پیش کیا ہے کہ ہمیں بار بار انہیں صالحین امت کے تقوےٰ اور علم کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ

---

[۷] کتاب التاج الجامع الاصول جلد ۲ صفحہ ۳۴۵ - [۸] عینی شرح بخاری جلد ۶ صفحہ ۴۹

[۹] احکام القرآن ——— ابوبکر جصاص جلد ۱ - صفحہ ۴۱

میں نہ تو امام ابوحنیفہ اور نہ ہی دوسرے حنفی ائمہ کے علم و تقوٰی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بلکہ جو اس پر عمل کرتا ہے اس کے متعلق یہ فیصلہ صادر فرما دیا جاتا ہے اور دھمکی دی جاتی ہے ؎

"اس ملک میں یہ تحریک ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے مال و جان کا زبردست زیاں کرنا ہوگا۔ اور یہاں یہ اس وقت کامیاب ہو سکے گی جب یہاں کی عظیم اکثریت خدا اور اس کے رسول سے منہ موڑ لے"؛ ؎

نعوذ باللہ من ذالک ۔۔۔ یہ حضرات اتنا بھی خیال نہیں فرماتے کہ ان کے قلم کی زد کہاں کہاں تک پہنچے گی۔ اور دیکھئے۔ ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

اس بنا پر یہ تحریک اس نظامِ حیات کے خلاف ایک سازش ہے جس کے قیام کا ہم نے اپنے آئین اور دستور میں اعلان کیا ہے؛

ایک دفعہ پھر طلاق بدعت کے سلسلے میں ان کی مدافعت کو سامنے لائیے کہ کس طرح امام ابوحنیفہ رح اور حنفی ائمہ کے علم و تقوٰی کا غلط طریقہ پر واسطہ دیا تھا۔ لیکن ملاحظہ فرمائیے کہ خاندانی منصوبہ بندی، جیسے اہم مسئلہ میں ان کے جائز اور صحیح مسلک کا مکمل بلیک آؤٹ اور جو اس پر عمل کرے اسے دھمکیاں ۔۔۔!

ان حضرات نے ضبطِ ولادت پر ہزاروں صفحے لکھے ہیں۔ لیکن حرام ہے کہ کہیں ائمہ حنفیہ کے مسلک کی طرف خفیف سا اشارہ بھی فرمایا ہو۔ قوم حیران ہے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کتاب و سنت کے مطابق قانون ہو تو کہا جاتا ہے کہ حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ اور اگر حنفی مذہب کے مطابق ہو تو پھر بھی قابلِ اعتراض۔ ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں!

لیکن پھر جب اپنی ضرورت کا تقاضا ہوا تو امام ابوحنیفہ رح کا نام پھر اسی شان سے لیا جانے لگا۔ اگست ۱۹۶۵ء کے ترجمان القرآن سے چل کر آپ دسمبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ تک پہنچیں تو آپ دیکھیں گے کہ امام صاحب کے کارنامے پھر اسی آب و تاب سے بیان کئے جا رہے ہیں کہ کس طرح انہوں نے حکومت سے ایک طرف ہو کر پوری یکسوئی سے اسلامی قانون کی تدوین کر ڈالی۔ کاش! آپ لوگ بھی امام صاحب کے اسی اسوہ کو مشعلِ راہ بناتے اور اسلامی قانون کو بازیچۂ اطفال

---

؎ ترجمان القرآن۔ بابت اگست ۱۹۶۵ء (اشارات)۔

بنانے کی بجائے اس کی تدوین کی طرف دھیان دینے۔

لیکن کیا امام صاحب کے یہ کارنامے بغیر کسی مقصد کے بیان کئے جا رہے ہیں؟ ہرگز نہیں! ان کی طرف ایک غلط طور پر منسوب کتاب "فقہ اکبر" میں کچھ مفید مطلب باتیں مل رہی تھیں انہیں پیش کر دیا گیا۔ اس کتاب کے متعلق برصغیر کے مشہور محقق علامہ شبلیؒ کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

"فقہ اکبر کو اگرچہ فخر الاسلام بزدوی، عبدالعلی بحر العلوم، و شارحین فقہ اکبر نے امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے لیکن ہم مشکل سے اس پر یقین کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب جس زمانے کی تصنیف بیان کی جاتی ہے اس وقت یہ طرز تحریر پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ بطور ایک متن کے ہے اور اس اختصار اور ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے جو متاخرین کا خاص انداز ہے مابیکجا اس میں جوہر و عرض کا لفظ آیا ہے حالانکہ یہ فلسفیانہ الفاظ اس وقت تک زبان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔"[1]

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ ان حضرات سے دو ٹوک الفاظ میں اسلامی قانون کی تدوین جدید کی بنیاد متعین کروائیں۔ یہ کوئی بہت لمبا چوڑا کام نہیں۔ اگر دیانت داری سے کرنے کا ارادہ ہو تو صرف "ایک سطر" گھیرے گا۔ یہ نہ ہو کہ کبھی کتاب و سنت کا نعرہ لگایا جائے اور جب کتاب و سنت کے مطابق ہو تو فرما دیا جائے کہ حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ اور حنفی مذہب کے مطابق ہو تو پھر دھمکیاں! خیال رہے کہ یہ جواب بالکل دو ٹوک ہونا چاہیئے ورنہ یہ حضرات کوشش کریں گے کہ آپ کو اپنے الماریاں بھر دینے والے لٹریچر میں گم کر دیں۔

---

## طلوعِ اسلام

اس مقالہ کی اشاعت سے مقصد اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ ہمارے ہاں کے مذہب کے یہ اجارہ دار، شرعی معاملات کے پیش کرنے میں بھی کس قدر "دیانت" سے کام لیتے ہیں۔ ورنہ طلاق اور خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے متعلق تو قرآن کریم کی روشنی میں ان صفحات میں کئی مرتبہ بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

---

[1] سیرت النعمان۔ علامہ شبلی نعمانی مکتبہ برہان دھلی۔ ۱۹۵۶ء۔

# پاکستان کی اندرونی جنگ

## اسکے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

یوں تو اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی تاریخ بڑے دلدوز واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن ان میں سب سے بڑھ کر فتنہ انگیز حادثہ وہ تھا جس نے دینِ خداوندی کی وحدت کو مذہب اور سیاست کی ثنویت میں بدلا جب خلفائے راشدین کے جانشینوں نے سیاسی معاملات تو اپنی ملوکیت کی گرفت میں لے لئے اور مذہبی امور کو پیشوائیت کے سپرد کر دیا۔ بظاہر یہ دو الگ الگ کیمپ دکھائی دیتے تھے لیکن ان کے مابین ایک ملی بھگت اور "شریفانہ معاہدہ" کم و بیش ہر دور میں قائم رہا۔ مسلمان حکمران ان مذہبی پیشواؤں کے لئے مالی وظائف کا انتظام کرتے اور اسکے بدلے میں مذہبی پیشوائیت ان حکمرانوں کو "امام المسلمین" اور "ظل اللہ" کے مقدس خطابات سے یاد کرتی۔ ملوکیت اور پیشوائیت کا یہ سلسلہ صدیوں سے برابر وحدتِ دین کو مذہب و سیاست کی مشرکانہ تفریق کی بھینٹ چڑھائے چلا آرہا ہے اور اسکے جو تلخ نتائج ہماری تاریخ کے ہر دور میں اُبھر اُبھر کر سامنے آتے رہے اس کی تفصیل بارہا ہمارے قارئین کے سامنے آتی رہی ہے۔

اسلام نام ہے ایک دین اور نظامِ حیات کا۔ وہ اپنے اصول و اقدار کی وحدت کے زور پر ہی انسانی زندگی میں جنتِ ارضی کی بساط بچھا سکتا ہے۔ اسی وحدت سے شرفِ انسانیت کا نشو و ارتقاء ممکن ہے۔ اسی وحدتِ دین کی عالم آرا و کارفرمائیاں اور رخشندہ و تابندہ نتائج عہدِ رسول اللہ وَالَّذِينَ مَعَهُ میں ابھر ابھر کر منظرِ عام پر آئے تھے۔ اس وقت نہ ملوکیت کے تخت و تاج نظر آتے اور نہ مذہبی پیشواؤں کا کوئی الگ گروہ امت میں موجود تھا۔ پوری امت کا ایک زندہ نظام تھا

لیکن جب اس نظام کی وحدت مذہب وسیاست اور ملوکیت و پیشوائیت کی ثنویت کا شکار ہوئی اس کی رواں دواں گاڑی اپنی حقیقی پٹڑی سے اتر گئی۔ فقہ اسلامی کے نام پر الگ الگ مکاتیبِ فکر نے جنم لیا اور نتیجتہً امت لاتعداد گروہوں، فرقوں اور فقہی مذاہب میں بٹ گئی۔ وحدتِ ملی میں یہ نارواانتشار صدیوں سے برپا ہے اور اُمت کی سیہ بختیاں اور حرماں نصیبیاں اور داخلی فتنہ سامانیاں پکار پکار کر اس کے تہلکہ انگیز نتائج کی شہادت دے رہی ہیں۔

صدیوں سے یہ صورتِ حال جاری تھی کہ ایک مردِ حق آگاہ نے اس ثنویت سے امت کو نجات دلانے اور وحدتِ دین کو ایک نظامِ مملکت کی صورت میں عملاً متشکل کرنے کے لئے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ یہ علامہ اقبال ؒ تھے جو اسلام کو عربی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے یہ ضروری سمجھتے تھے۔ کہ اسے ایک آزاد خطۂ ارض میں قرنِ اول کے جیتے جاگتے نظام کی صورت دی جائے۔ ان کی رحلت کے بعد جب قائداعظم ؒ نے اس تحریک کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی۔ تو ساری دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں مذہبی پیشوائیت ( THEOCRACY ) کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اور قرآن کریم کے اصول و اقدار یہاں ملتِ پاکستان کے نمائندگان کی وساطت سے حاصل تکمیل کو پہنچیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تحریکِ پاکستان دشمنانِ اسلام کی بھرپور مخالفت کا سامنا کر رہی تھی تو کانگرس، ہندو مہا سبھا، اور دیگر مخالفین کے شانہ بشانہ ہماری مذہبی پیشوائیت بھی پورے جوش و خروش سے اس مملکت کے قیام کے خلاف صف آراء دکھائی دے رہی تھی جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے نام پر اپنے قیام کی وجہ جواز پیش کر رہی تھی

تاریخ پاکستان کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ قرار پائے گا کہ وہی مذہبی پیشوا جو دشمنانِ اسلام کا مقدمتہ الجیش بن کر تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے، حصولِ پاکستان کے بعد یہاں اپنے اقتدار کی بحالی کے لئے منظم گروہ کی شکل اختیار کر گئے اور قائداعظم ؒ کے جانشینوں کی سیاسی مصلحت کوشیوں نے انہیں یہ سنہری مواقع فراہم کر دیئے کہ امورِ مملکت میں وہ اپنی بالادستی کے لئے، مذہب کے مقدس نقاب میں، جو تخریبی مہم بھی حرکت میں لانا چاہیں، لا سکیں۔ پاکستان کی گزشتہ اٹھارہ برس کی تاریخ کا سب سے عبرتناک اور خونچکاں باب یہی ہے کہ جس مقصدِ عزیز کے لئے اس مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا وہ سیاسی طالع آزماؤں اور مذہبی پیشواؤں کی ملی بھگت سے زیر وزبر ہو کر رہ گیا۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ چاہتی یہی ہے کہ اول تو مملکت کا پورا اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو سیاست اور مذہب کی ثنویت قائم رکھ کر اپنی متوازی حکومت کو عملاً

قائم رکھا جائے۔ اور اس طرح حسبِ ضرورت مذہب و شریعت کے نعرے بلند کر کے مملکت کو تعمیر و ترقی کی منزل پر ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ آپ ان مقدسین کی صفوں میں ایک ایک گروہ بھی پائیں گے جو عوام کو مبتلائے فریب رکھنے کے لئے یہ نعرہ بلند کرتا ہے کہ سیاست کو مذہب سے الگ رکھا نہیں جا سکتا۔ آپ اس نعرے سے لازمًا اس غلط فہمی میں کھو جائیں گے کہ کم از کم یہ گروہ تو ضرور ایسا ہے جو مذہب اور سیاست کی ثنویت کا قائل نہیں لیکن قدم قدم پر یہ حقیقت آپ کے سامنے آئے گی کہ اس طائفہ مقدسہ کی ہر تان بالآخر اس پر ٹوٹتی ہے کہ سیاست کو مذہب کے تابع کر دو۔ اور چونکہ مذہب کے اجارہ دار ہم ہیں اسلئے (اس طرح) زمام سیاست ہمارے حوالے کر دو۔ یہ گروہ بھی تحریک پاکستان کا بدترین مخالف رہا اور مذہب کا نقاب اوڑھ کر مدتوں تحریک پاکستان کے ممتاز رہنماؤں کے حسن نیت اور عظمت کردار پر کیچڑ اچھالتا رہا۔ اور قیام پاکستان کے بعد آج تک ہر اس تخریبی مہم میں ہراول دستے کے طور پر شریک نظر آئے گا، جو مذہب کے نام پر اربابِ سیاست کی کارفرمائی کے خلاف حرکت میں آتی رہی۔ سیاسی اقتدار کی ہوا نا کیوں میں یہ گروہ ہمیشہ مذہب کے نقاب کو کام میں لاتا رہا جسبِ ضرورت مذہبی پیشوائیت کا مضحکہ بھی اڑاتا رہا اور جہاں اپنی سیاسی مصلحتوں کا کوئی تقاضا سامنے آیا، وہاں اسی پیشوائیت کی تائید و تعاون میں بھی پوری ڈھٹائی کا ثبوت مہیا کرتا رہا ـــــ!

یہ ہماری اٹھارہ سالہ تاریخ کی ایک دردناک داستان ہے جس کا سلسلہ آج تک برابر جاری ہے اور اس کے نتیجے میں جو بدنصیبیاں اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے اس پاکستان کے حصے میں آئی ہیں، ان پر جس قدر آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ ہم اس داستانِ غم کے ماضی کے اوراق الٹنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ داستان اس قدر طویل ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے سینکڑوں صفحات چاہئیں۔ اس وقت ہم اس تازہ ہنگامہ آرائی کو قارئین کے سامنے لانا چاہتے ہیں جو رویت ہلال کے سلسلے میں ابھی ابھی عیدالفطر کے موقع پر ملک گیر صورت میں برپا ہو گئی ہے۔ اس معمولی سے مسئلے کو اس نازک مرحلہ پر مذہب کا رنگ دے کر قومی اتحاد اور ملکی امن کو جس طرح فتنہ و فساد کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے وہ ہماری ملکی و قومی سالمیت کے لئے بہت بڑے خطرے کا الارم ہے۔ اور ایسے حالات میں حکومت کی کمزوری کا اگر یہی عالم رہا تو ہمیں خطرہ ہے کہ ان کی یہ روشِ مصلحت آمیز اس فتنہ و شر کی حوصلہ افزائی کا موجب بنتی چلی جائے گی۔

غور فرمائیے کہ بات صرف اتنی تھی کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی اپنے وسائل اور استطاعت کے

مطابق ۲۹ رمضان المبارک کی شام کو، مطلع ابر آلود ہونے کے باعث عید کا چاند دیکھنے یا اس سلسلے میں کوئی شہادت حاصل کرنے میں ناکام رہی اور پونے آٹھ بجے کی خبروں میں اعلان کر دیا گیا کہ ملک کے کسی حصے میں چاند نہ دیکھے جانے کے باعث اگلے روز عید نہیں ہوگی۔ اس فیصلے اور اعلان کے بعد ملک کے بعض حصوں سے چاند دیکھنے کی اطلاعات مل گئیں۔ اور ان اطلاعات کے برو ئے شہادت قابل اعتماد ہونے پر نصف شب کے قریب سابقہ فیصلے پر نظر ثانی کے بعد اگلی صبح عید منانے کا اعلان کر دیا گیا۔ سرکاری ذرائع اس نئے فیصلے سے عوام کو مطلع کرنے کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا اور سحری سے بہت قبل ہر ضلع کے ذمہ دار افسران نے یہ اطلاع ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دی۔ یہ فریضہ ملک کے تمام ریڈیو سٹیشنوں سے بھی ادا کیا گیا اور مساجد کے لاؤڈ سپیکروں اور دیگر ذرائع سے بھی۔ کوئی دیانت دار انسان اس معاملہ پر حکومت پر کسی بدنیتی یا تساہل کا الزام عاید نہیں کر سکتا۔ اس سارے معاملے میں اگر کوئی خرابی نظر آتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پونے آٹھ بجے کسی قطعی فیصلے کا اعلان کرنے کی بجائے یہ بتا دینا چاہیئے تھا کہ رویت ہلال کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوششیں جاری ہیں اس لئے اس سلسلے میں قطعی اعلان کا مزید انتظار کر لیا جائے لیکن یہ خرابی جس کی بعد میں تلافی کر دی گئی، ایسی نہیں تھی کہ ملک کے طول و عرض میں لاتعداد خدائی فوجدار یہ نعرے بلند کرتے ہوئے ہاتھوں میں ڈنڈے لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور جگہ جگہ یہ ہنگامہ بپا کر دیں کہ دین، مذہب، شریعت سب خطرے میں پڑ گئے۔ سورج سوا نیزے پر آگیا۔ قیامت قریب آگئی ۔۔۔ چاروں طرف "حرام و حلال" کا شور مچ جائے۔ مسجدوں کو تالے لگا دیئے جائیں اور جو امام اگلی صبح کراچی کے پولو گراؤنڈ میں نماز عید کی امامت کے لئے آگے بڑھے اس کا دامن تار تار کر دیا جائے۔ حکومت کیخلاف دھمکیوں کا الگ سلسلہ شروع ہو جائے اور ایک فرد، یا مذہبی اجارہ داروں کا ایک گروہ اس اسلامی تقریب کو حسب روایت منانے کے خلاف علم جہاد بلند کر دے۔

اس سلسلے میں دارالسلطنت کراچی میں جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل وہاں کے ایک ہفت روزہ اخبار کی زبانی سن لیجئے۔ اس تفصیل میں بتایا گیا ہے کہ:۔

"کراچی میں رات بارہ بجے کے بعد وزارت امور داخلہ کی طرف سے چاند نکلنے کی اطلاع پہنچ گئی تھی اور سحری کے وقت اکثر مساجد میں، جہاں لاؤڈ سپیکر نصب تھے اس اعلان کو مشتہر بھی کر دیا تھا۔ عید کا اعلان بھی ہوا اور کئی بار ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مولوی احتشام الحق کی جانب سے اعلان ہوا کہ

عید نہ ہوگی۔ اور حکومت کے اعلان کو مسترد کر دیا گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام لاؤڈ اسپیکر علماء کا فیصلہ کا اعلان کرنے لگے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ ایک ایک کر کے مفتی محمد شفیع، مولوی محمد یوسف بنوری اور کئی دوسرے معروف و غیر معروف مولویوں کے نام ان لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے سنے جانے لگے ان آوازوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ ان مقدسین نے حکومت کے اعلان کو اپنے "حقوق" پر ضرب خیال کرتے ہوئے بڑے منظم طریق پر ــــ جیسے پہلے سے منصوبہ بندی ہو چکی ہو ــــ ہنگامہ آرائی کا سامان پیدا کر دیا۔ "نماز ہوگی" "نماز نہ ہوگی" کے آوازے سنے جانے لگے۔ دونوں خیال کے افراد تگ و دو کرنے لگے۔ دوڑ دھوپ شروع ہوئی اور دن نکلا تو لوگ مساجد کی طرف چل پڑے۔ اکثر اس نیت سے کہ دوگانہ ادا کریں اور بہت سے اس غرض سے کہ انتشار کا باعث بنیں۔

## مساجد کے دروازوں پر تالے

ظاہر ہے کہ جب مذکورہ علماء کی روش۔ عاقبت نا اندیشی یا محض ان کے تقدس کے تحفظ کے صدقہ میں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تو بھی ہر شخص کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ نماز دوگانہ ادا کرے یا روزے سے رہے لیکن ان مقدسین کے پیرو یہ بھی برداشت نہ کر سکے کہ کوئی شخص ان علماء کے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے خداوندِ قدوس کے سامنے سربسجود ہو۔ انہوں نے لوگوں کو مسجد جانے سے روکنا چاہا۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ شرمناک حرکت کی کہ جس سے ہندو کیا گبر و یہود بھی شرمائیں اور شاید بد ترین قسم کے کافر بھی ایسی حرکت پر فخر نہ کر سکیں۔ وہ یوں کہ مساجد کے دروازوں پر تالے ڈال دیئے گئے۔ مساجد میں داخلے کے راستے مسدود ہوئے۔ اور یہ شرمناک و ذلیل حرکت ان لوگوں نے کی جو مساجد کے ناخدا سمجھے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے ایسی بند مساجد میں نیو ٹاؤن کی جامع مسجد بھی شامل ہے کہ جس کی ناخدائی مفتی محمد شفیع اور مولوی محمد یوسف بنوری کے دستِ قدرت میں ہے۔

مسلمانوں کے اس طبقہ نے کہ جو دوگانہ ادا کرنا چاہتا تھا بڑے صبر و تحمل سے کام لیا اس تالہ بندی کی پریشانی میں کتنے سر بسجود ہی نہ ہو سکے۔ مساجد تالہ بندی کرنے والوں کی جائیداد نہ تھی۔ ان کے باپ دادا کی ملکیت نہ تھی۔ اور انہیں شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً کسی طرح یہ حق نہ پہنچتا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کو ان میں داخل ہو کر نماز ادا کرنے سے روک سکیں۔ ہو سکتا تھا کہ من چلے مسلمان ان تالوں کو توڑ کر مساجد داخل ہو جاتے تو اس کا لازمی نتیجہ کشت و خون ہوتا۔ مسلمانوں کا خون بہتا اور غالباً ان ــــ

انتشار پسندوں کا یہی مقصد تھا کہ وہ حکومت کیخلاف اس نام سے ہی کوئی محاذ قائم کرسکیں۔

# احترامِ تلاوتِ قرآن

پھر انتشار پسندوں کی شرمناک حرکات تالہ بندی تک ہی محدود نہ رہیں۔ انہوں نے پولو گراؤنڈ کا رخ بھی کیا جہاں کراچی کی مرکزی جماعت ہو رہی تھی۔ جہاں شہر کے شرفاء، امراء، حکام، تاجر اور عوام سب ہی موجود تھے۔ چالیس پچاس ہزار کا مجمع ہوگا۔ پاکستان بحریہ کے کمانڈر انچیف، مسلم ممالک کے سفراء اور نمائندگان اس اجتماع عظیم میں شامل تھے۔ یہ اجتماع "وقار و عزتِ ملت" کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ ان انتشار پسندوں نے اس کا بھی منہ چڑانا شروع کر دیا۔ ہنگامہ آرائی کا بندوبست ہوا اور ان نفاق پروروں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ غیر ممالک کے مسلم نمائندگان اور غیر مسلم ممالک کے غیر مسلم تماشائی ہماری ان حرکات کا کیا اثر لیں گے اور پھر ایسی ذلیل حرکات کا تو وہم وگمان بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ کہ عین اس حالت میں کہ امام تلاوتِ قرآن پاک کر رہا تھا۔ ان مخالفین کو احترام کلام پاک کا بھی خیال نہ آیا۔ یہ لوگ ہنسی مذاق اڑاتے رہے، تالیاں بجاتے رہے اور ایسی حرکتیں کرتے رہے کہ جو ابتدائے اسلام میں عرب کے کفار کیا کرتے تھے اور غیر ممالک کے تماشائی دل کھول کر فوٹو لیتے رہے تاکہ ہمارے "علمائے کراچی" کی عاقبت نا اندیشی سے پیدا شدہ اجتماع اور انتشارِ ملتِ اسلامیہ کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ پولو گراؤنڈ میں پولیس کا انتظام قابلِ تعریف، اور ان کا صبر و تحمل قابلِ ذکر ہے۔ کہ جس وجہ سے کوئی ناخوشگوار واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا۔"

(آوازِ پختون۔ کراچی ــــ ۲۹۔ جنوری ۱۹۶۶ء)

**پنجاب** کے سلسلے میں انتشار پسندی کی مزید تفصیل روزنامہ 'نوائے وقت' کی زبانی سنیئے روزنامہ مذکور نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ :-

> " لائل پور سے ہمارے نمائندے کی اطلاع کے مطابق لائل پور میں اتوار اور پیر کو دو عیدیں منائی گئیں۔ اگرچہ عید کے ہونے کے بارے میں سرکاری اعلان کا لوگوں کو اتوار کے روز سحری سے پیشتر ہی علم ہو چکا تھا۔ لیکن علماء نے اس اعلان کو ناجائز قرار دے دیا اور کہا کہ چونکہ شوال کا چاند دکھائی نہیں دیا اسلئے عید پیر کو ہوگی ــ "

(نوائے وقت۔ ۲۵، جنوری ۱۹۶۶ء)

سرکاری اعلان کے باوجود لوگوں کو اتوار کو عید منانے سے کیوں روکا گیا اس کے متعلق مذہب

وشریعت کے خود ساختہ اجارہ داروں کی پیش کردہ وجوہات بھی سن لیجئے۔

علمائے کرام نے اتوار کے روز فتوے دیا کہ ہفتہ کی شب کو عید کا چاند دکھائی نہ دینے کے باعث نماز تراویح ادا کی جا چکی ہے اس لئے جن لوگوں نے روزہ رکھا ہے وہ روزہ نہ کھولیں۔ (نوائے وقت - ۲۵ - جنوری)

مولانا احتشام الحق صاحب کا فتوے سنیئے:۔

مولانا احتشام الحق تھانوی نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ عید کے بارے میں حکومت کا اعلان مذہبی اصولوں کے یکسر برعکس ہے انہوں نے زور دے کر کہا کہ روزہ اتوار کو ہے۔ (ایضاً)

مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی نے فرمایا:۔

مذہبی نقطہ نظر سے عید الفطر کا منانا یا نہ منانا بہت نازک بات ہوتی ہے۔ اگر روزہ کے دن عید کر لی جائے تو عید حرام ہو جاتی ہے اور اگر عید کے دن روزہ رکھ لیا جائے تو روزہ حرام ہو جاتا ہے۔ جب وزارت داخلہ نے عید الفطر کا اعلان جاری کیا تو اس میں چاند کے ہونے کی کوئی شہادت نہیں تھی اور شرعی نقطہ نظر سے جب تک کوئی معتبر عینی شاہد نہ ہوں، عید نہیں ہو سکتی۔ (ایضاً)

جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جو مذہب کے نام پر ایسے مواقع کا سیاسی فائدہ اٹھانے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، حسب عادت آگے بڑھتے ہیں اور عوام کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اس مرتبہ عید الفطر کے معاملہ میں پورے ملک کے اندر جو اختلاف رونما ہو گیا ہے۔ وہ حکومت کی بے تدبیری کا براہ راست نتیجہ ہے۔ حکومت نے رویت ہلال کے اعلان کا اختیار اپنے ذمہ یہ کہکر لیا تھا کہ اس طرح وہ انتشار دور ہو جائے گا جو کبھی رویت کے معاملہ میں پیش آجاتا ہے۔ لیکن اب اس کے اپنے غلط طریق کار کی وجہ سے وہی انتشار برپا ہو گیا۔ (ایضاً)

اب ذرا وہ حل بھی ملاحظہ ہو جو اس سلسلے میں مودودی صاحب نے آئندہ کے لئے تجویز فرمایا ہے:۔

آئندہ کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ حکومت رویت ہلال کمیٹی میں ایسے معروف علما

کو شامل کرے جن کو ملک میں اعتماد کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور جن کی آواز ملک کے ہر گوشے میں لوگ بکثرت پہنچاتے ہیں۔ یہ حضرات خود کراچی، لاہور، راولپنڈی، ڈھاکہ، سے ریڈیو پر رویت ہونے یا نہ ہونے کا اعلان کریں۔ رویت ہونے کی صورت میں یہ بتائیں کہ انہوں نے کن شہادتوں کی بنا پر اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اور نہ ہونے کی صورت میں رات کے مختلف اوقات میں وقفہ وقفہ کے بعد لوگوں کو بتاتے رہیں کہ رویت کی کوئی شہادت بہم پہنچی ہے یا نہیں۔ یہ انتظام اگر حکومت نہ کر سکتی ہو یا نہ کرنا چاہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ اعلان رویت کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لے۔ (ایضاً صہ)

یعنے تان اسی پر آکر ٹوٹتی ہے کہ رویت ہلال کا معاملہ مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دیا جائے۔ اور یہ وہ صاحب ہیں جن کا دعوے ہے کہ وہ مذہب و سیاست کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھتے۔ مودودی صاحب اگر اپنے اس دعوے میں واقعی دیانتدار ہیں اور میکیاؤلی سیاست کے قائل نہیں تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ رویت ہلال کا معاملہ ہی کیوں ان مذہبی علماء کے سپرد کیا جائے۔ ملک کے دیگر اہم تر معاملات بھی کیوں نہ ان حضرات کے سپرد کئے جائیں۔ کیا ہمارے ہاں لاتعداد ایسے مسائل موجود نہیں جن کی شرعی اہمیت رویت ہلال سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے جب اسلام میں سیاسی معاملات کو مذہب سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ تو پھر یہ مطالبہ بھی کیوں نہیں کیا جاتا کہ رن آف کچھ کے تنازعہ کے سلسلے میں بھی معروف علماء حضرات کی ایک کمیٹی مقرر کی جانی چاہیئے تھی جو مختلف ریڈیوں اسٹیشنوں سے لوگوں کو مختلف وقفوں پر یہ بتاتی رہتی کہ وہ اب کس فیصلے پر پہنچی ہے۔ مودودی صاحب یا ان کے ہم خیال دیگر ہنگامہ پسند آخر تاشقند کانفرنس کے موقع پر کیوں مہر بہ لب رہے اور کیوں نہ شور مچایا کہ اس کانفرنس میں بھی صدر مملکت کے ساتھ علماء کا ایک وفد جائے جو ہر اجلاس کے بعد پیش نظر معاملات کے بارے میں شرعی رائے کو پیش کرے اور اپنا فیصلہ دے۔ حالیہ پاک بھارت جنگ شروع کرنے یا بند کرنے کے اعلان کے موقع پر یہ مطالبہ کیوں نہ اٹھایا گیا کہ ان اُمور کو شرعی نقطۂ نظر سے طے کرنے کے لئے علماء حضرات کی ایک کمیٹی مقرر ہونی چاہیئے۔ معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوگا۔ بلکہ آگے بڑھے گا اور سوال پیدا ہوگا کہ ملک کی صدارت و قیادت کے فیصلے بھی کیوں نہ ان "معروف علماء" کی کمیٹیوں کے سپرد ہوں۔ کیا ان معاملات کی کوئی شرعی حیثیت نہیں؟ کیا رویت ہلال کے مقابلے میں ان کی دینی اہمیت کہیں زیادہ نہیں؟

اس سے قبل رویتِ ھلال کے سلسلے میں ۱۹۶۱ء میں جو شورش برپا کی گئی تھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مئی جون ۱۹۶۱ء کے طلوعِ اسلام کی اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ رویتِ ھلال کا تعلق عینی شہادت سے ہے اس لئے اس معاملہ میں مولوی حضرات کی شرکت پر اس قدر زور دینے کا آخر مطلب کیا ہے؟ جب قتل اور پھانسی جیسے اہم ترمعاملات کا فیصلہ ہمارے ہاں کی عدالتیں پیش آمدہ عینی شہادتوں کی رُو سے کرتی ہیں۔ جب دوسرے اہم سے اہم اور نازک سے نازک معاملات میں ان حضرات کے عمل دخل کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو رویتِ ہلال کے معاملہ میں شرعی حیثیت کیوں اس قدر نمایاں کی جارہی ہے۔

مارچ ۱۹۶۱ء میں رویتِ ھلال کے سلسلے میں پیدا شدہ شورش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مودودی صاحب کے ترجمان القرآن نے (اپنی اشاعت اپریل ۱۹۶۱ء میں) لکھا تھا کہ

"افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان قائم ہونے سے پہلے متحدہ ھند میں کبھی اس طرح انتشار برپا نہیں ہوا تھا"

ان الفاظ پر غور کیجئے۔ مودودی صاحب حکومت کو ہی موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہے بلکہ خود پاکستان کے قیام کو بھی اس انتشار کی بنا قرار دے رہے ہیں اور پھر یہ دروغ گوئی کس قدر ڈھٹائی پر مبنی ہے؟ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابھی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں زندہ موجود ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان میں دو دو تین تین عیدیں ہوتی دیکھی ہیں۔ اور بارہا یہ بھی انہوں نے دیکھا کہ دن کے بارہ بارہ بجے روزے توڑے گئے۔ مودودی صاحب ترجمان القرآن کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ رویتِ ھلال کے سلسلے میں انہیں جو پریشانیاں لاحق ہورہی ہیں ان کا سرچشمہ پاکستان اور حکومتِ پاکستان ہیں۔ ورنہ ایسا انتشار تو متحدہ ھند کی غلامی کے دور میں بھی برپا نہیں ہوا تھا۔ عیدیں تو وہاں بھی دو، دو، تین تین ہوجایا کرتی تھیں۔ ان پر وہاں انتشار اس لئے برپا نہیں ہوا تھا کہ وہاں آپ حضرات کے سامنے وہ سیاسی مقاصد نہیں تھے جن کے پیشِ نظر آپ یہاں اس قسم کا انتشار برپا کراتے ہیں۔

اور پھر ان حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ جس چیز کو یہ خود اصل اسلام اور عین شریعت بنا کر پیش کرتے ہیں وہی چیز جب حکومت رائج کرتی ہے تو اسے خلافِ شریعت اور خلافِ اسلام کہہ کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا جاتا ہے۔ عائلی قوانین کو ہی لیجئے۔ ان قوانین کے خلاف ہنگامے اور شورو شر پیدا کرنے میں مودودی صاحب آج سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے ان کی کتاب "حقوق الزوجین" کا مطالعہ کیا

ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر و بیشتر قوانین اس سے قبل خود ان کے نزدیک عین شریعت تھے۔ یہ ہے ان حضرات کی کیفیت۔ کہ کسی نہ کسی طرح حکومت کے خلاف ہنگامے اور شورشیں برپا کر کے مذہبی پیشوائیت کو امورِ مملکت پر مسلط رکھا جائے۔

مذہبی طبقہ کی ان شورش انگیزیوں سے متاثر ہو کر ہمارے ایک صوبائی وزیر نے بھی (جو صوبائی مسلم لیگ کے صدر بھی ہیں) یہ تجویز پیش کر دی ہے کہ رویتِ ہلال کا معاملہ کلیتہً علمائے کرام کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ اور حکومت اس میں کوئی دخل نہ دے۔ اس تجویز سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ تجویز ایک آہِ سرد (VOICE OF DESPAIR) ہے جو ملک کی بدقسمتی پر نوحہ خوانی کرتی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے اس محترم نے اس سوال کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں فرمایا۔ یہاں سوال چاند دیکھنے کا نہیں۔ سوال تو وہی بنیادی ہے جس کی طرف ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی ان حضرات کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ — قیصر کو قیصر کا دو اور خدا کو خدا کا۔ یعنی وہی مذہب و سیاست کی ثنویت — اگر آج آپ رویتِ ہلال کے (نہایت معصوم سے) مطالبہ کو اس طرح تسلیم کر لیتے ہیں تو کل کو ان کے اس مطالبہ کو کس طرح مسترد کیا جا سکے گا کہ شریعت سے متعلق جملہ معاملات میں آخری فیصلہ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے؟ کیا آپ پاکستان میں یہی اندازِ مملکت رکھنا پسند کرتے ہیں؟

اخبارات میں ایک اور خبر یہ بھی شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ:-

"پیر کی صبح کو کراچی کے شہریوں نے عید منائی۔ نمازِ عید کا سب سے بڑا اجتماع پولو گراؤنڈ میں ہوا جہاں مولانا احتشام الحق نے جماعت کرائی۔ نمازِ عید پڑھنے والوں میں مرکزی وزیرِ صنعت الطاف حسین، کمشنر کراچی سید دربار علی شاہ، ڈپٹی کمشنر کراچی احمد ملک، چیئرمین کراچی کارپوریشن ضیاء الدین، وائس چیئرمین حافظ حبیب اللہ اور مسلم ممالک کے سفیر بھی شامل تھے"۔ (نوائے وقت۔ ۲۵ جنوری ۱۹۶۶ء)

اس خبر سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ مرکزی وزیر اور حکومت کے ذمہ دار افسران کے نزدیک حکومت پاکستان کے رویتِ ھلال کے سرکاری اعلان کے مقابلے میں مولانا احتشام الحق صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی ذاتی رائے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ انہوں نے ایک اہم سرکاری اعلان سے کھلم کھلا روگردانی اختیار کی اور ان لوگوں کا ساتھ دیا جو مذہب کے مقدس نام پر ملک میں فتنہ و انتشار برپا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ممکن ہے یہ حضرات اس کے جواب میں یہ کہہ دیں کہ نماز کا معاملہ ایک شخص کا انفرادی اور پرائیویٹ مسئلہ ہے اس لئے انہوں نے جس دن مناسب سمجھا نماز ادا کرلی۔ اس پر لازماً یہ سوال سامنے آئیگا۔ کہ جس معاملہ کا فیصلہ حکومت اپنے ذمے لے لیا وہ افراد کا ذاتی اور پرائیویٹ مسئلہ رہ جاتا ہے؟ جب حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ ہفتہ میں فلاں روز گوشت کا ناغہ رہے گا، یا کسی تقریب میں مہمانوں کی تعداد پچیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ تو کیا ـــــ حکومت کے ان فیصلوں کے بعد، کوئی سرکاری افسر یہ کہہ کر ان کی خلاف ورزی کر سکتا ہے کہ یہ اُس کا ذاتی مسئلہ ہے؟ اگر ان معاملات میں ایسا نہیں کیا جا سکتا تو حکومت کے اس اعلان کے بعد کہ عید اتوار کو ہوگی، کوئی سرکاری افسر یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں اس اعلان کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ میں عید سوموار کو کروں گا۔ ان حکام کی اس روش کی تہ میں بھی درحقیقت وہی مذہب اور سیاست کی ثنویت کا تصور کارفرما ہے۔ یعنے ان کے نزدیک تمدنی امور میں تو حکومت کا فیصلہ واجب الاطاعت ہوتا ہے لیکن امورِ شریعت میں اس کا فیصلہ یہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی بات مذہبی پیشوائیت یہاں منوانا چاہتی ہے۔

بعض اخبارات میں یہ مطالبہ بھی سامنے آیا ہے کہ جمہوری روایات کا احترام قائم رکھتے ہوئے وزیر داخلہ پاکستان کو اپنے منصب سے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ رویت ہلال کمیٹی پر جو الزام عائد ہوتا ہے، اُس کی آخری ذمہ داری وزارتِ داخلہ پر پڑتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ یہ آخری ذمہ داری خود صدرِ مملکت پر کیوں نہیں پڑتی اور ان حضرات کی طرف سے یہ مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا کہ انہیں بھی صدارت کے عہدہ سے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔

آخر میں ہم اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ تمام شورش انگیز یاں اصل بیماری نہیں بلکہ ایک بیماری کی علامات ہیں۔ یعنی اس قسم کے ہنگاموں سے قدامت پرست طبقے کا مقصد یہ ہے کہ نظامِ مملکت پر مذہبی پیشوائیت (THEOCRACY) کو مسلّط کرنے کا راستہ ہموار کیا جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مذہب و سیاست کی ثنویت کے ذریعے اپنی متوازی حکومت کو برقرار رکھا جائے۔ جیسا کہ ہم بار بار وضاحت کر چکے ہیں، یہ دونوں صورتیں اس ملک کو ہلاکت اور بربادی کے اُس جہنم کی طرف لے جائیں گی جس سے بعد از وقت اسے بچانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔ دونوں صورتوں میں ملک کی تعمیر و ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں گی۔ اور قومی زندگی کا آرام و چین اس قدامت پرستی کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ اس صورتِ حال کا واحد علاج ملک میں خلافت علےٰ منہاج نبوت کا قیام ہے۔ یعنے اسی نظام کا قیام جو خلافتِ راشدہ میں دنیا کے سامنے آیا تھا۔

جس میں نہ دینی و دنیوی امور کی کوئی تفریق تھی اور نہ مذہب و سیاست کی کوئی ثنویت۔ اس میں مذہبی پیشواؤں کا وجود تک نہ تھا۔ اس وقت تمام فیصلے حکومت کی طرف سے ہوا کرتے تھے۔ نوعِ انسانی آج جن ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہے اس میں قدامت پرستی کی زنجیریں گلے کا ہار نہیں بن سکتیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ کر رکھ دے گی اور اگر اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی۔ کہ یہی قدامت پرستی عین اسلام ہے۔ تو وہ اسلام سے ہی منحرف ہو کر دہریت اور کمیونزم کا رخ کرلے گی۔ اس لئے پاکستان کو اس صورتِ حال سے بچانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ کوئی مردِ مومن جراءت رندانہ سے کام لے کر یہاں اس حقیقی اسلام کو رائج کرنے میں کوشاں ہو جو انسانی مشکلات، اور خود پاکستان کے مصائب کا واحد حل ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا اس وقت تک ہمیں نہ تو قدامت پرستی کی تخریبی روش سے نجات ملے گی اور نہ زمانہ اسلام کی حقیقت کشا اور عالم آراء روشنی سے اپنی منزلِ مراد پانے کے قابل ہو سکے گا۔

دنیا کو ہے اُس مہدئ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

**طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ**

کنونشن کی وجہ سے طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ (بابت اپریل) کی اشاعت میں شاید کچھ دیر ہو جائے۔ قارئین اور ایجنسیاں اسے ملحوظ رکھیں۔

## پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

**کراچی میں**
ہر اتوار کی صبح کو — ۹ بجے —
سندھ اسمبلی ہال۔ بندر روڈ کراچی

**لیہ میں**
ہر جمعہ کو نمازِ جمعہ کے بعد
(ٹھیک تین بجے) تھل ہوٹل
(نزد ریلوے اسٹیشن)

**لائلپور میں**
ہر جمعہ کی شب کو بعد نمازِ عشاء بمقام
بزم خان محمد اکرم خان کی قیام گاہ پنجاب ٹمبر
(۸۰ ۔ ایم ۔ اے پیپلز کالونی)

**لاہور میں**
ہر اتوار کو ۲۵/بی گلبرگ
۹½ بجے صبح شروع
ہوتا ہے۔

پرویز

# "پاکستان کی نئی زیارت گاہیں"

(۲)

جنوری ۱۹۶۶ء کے طلوع اسلام میں پاکستان کے مختلف محاذوں کے متعلق میرے چشم دید احوال اور تاثرات شائع ہوئے تو اکثر مقامات سے یہ تقاضے موصول ہوئے کہ مجھے بقایا دو محاذ ــــ فاضلکا اور راجستھان سیکٹر ــــ بھی دیکھنے چاہئیں۔ بلکہ فاضلکا سیکٹر کی طرف سے تو اس قسم کے شکوے بھی سننے میں آئے کہ وہاں جو معرکہ سرزد ہوا تھا وہ، اگر زیادہ نہیں تو دیگر مقامات کی معرکہ آرائیوں سے کسی صورت میں کم بھی نہیں تھا لیکن، بایں ہمہ نہ اس کا کہیں تذکرہ ہوا ہے نہ قومی ترانوں میں اس کا نام تک آیا ہے۔ اس طرح قوم اس سیکٹر کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہو سکی۔ اس سے اس سیکٹر کی اہمیت میری نگاہوں میں اور بھی بڑھ گئی اور ۵ فروری کی صبح ہمارا قافلہ اس سمت روانہ ہو گیا۔ قریب دس بجے صبح ہم وساوا والا ریلوے اسٹیشن پر تھے جہاں ہمارے میزبان ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے ہم سیدھے ہیڈ سلیمانکی گئے جو وہاں سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس سیکٹر کی اہمیت کا نقطۂ ماسکہ یہی مقام ہے۔ یہاں دریائے ستلج سے تین بڑی بڑی نہریں نکلتی ہیں۔ جو ہزاروں مربع میل پر پھیلے ہوئے علاقہ کے لئے رگِ حیات ہیں۔ "ہیڈورکس" ایک عظیم پراجیکٹ اور فن انجنیری اور آب رسانی کا شاہکار ہے۔ بھارت اُسے، تقسیم ہند کے وقت، کسی نہ کسی طرح پاکستان کو دے تو بیٹھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت سے اس کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سابقہ جنگ میں یہی مقام اس کا ہدف تھا۔ پہلے تو تقسیم کی حد ہیڈورکس سے بالکل ملحق تھی لیکن ۱۹۶۰ء کے معاہدہ کی رُو سے یہ حد، قریب ایک میل آگے بڑھ گئی۔ اس علاقہ کی سیاحت کے بعد یہ حقیقت اور بھی ابھر کر سامنے آ گئی کہ ریڈ کلف باؤنڈری کمیشن کتنی بڑی سازش تھی اور اس کا اوارڈ ہمارے ساتھ کتنا بڑا فریب کر گیا

ہے۔ اس حدبندی کی رُو سے ہم قدم قدم پر بھارت کے اندر گھرے ہوئے ہیں اور اس سینکڑوں میل پر مشتمل علاقہ میں ہمارے لئے کوئی فطری حصارِ حفاظت (لائن آف ڈیفنس) موجود نہیں ہے!

۹ ستمبر کی صبح لاہور پر حملہ ہوا۔ اور ۷ کی صبح، ہیڈ سلیمانکی پر متعین ہماری حفاظتی فوج کو معلوم ہوا کہ بھارت ایک لشکرِ جرار لئے اِس سمت بڑھے چلا آ رہا ہے۔ اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ دس بجے شب ہیڈ ورکس پر ہلّہ بول دیا جائے۔ اُس وقت، اِس پورے علاقہ میں، پاکستان کی صرف تین بٹالین فوج تھی اور وہ بھی ایسی کہ جس کے پاس نہ ٹینک تھے نہ طیارہ شکن توپیں۔ اُدھر سے دشمن کے کم از کم تین بریگیڈ، ساز و سامان سے لیس سیلاب بلا کی طرح اُمنڈے چلے آ رہے تھے۔ اِدھر حالات ایسے تھے کہ ہماری اس مختصر سی فوج کو کہیں سے کمک نہیں پہنچ سکتی تھی ــــ کمک کہاں سے پہنچتی۔ قریب ترین فوجی اڈہ لاہور تھا۔ اور لاہور اس وقت خود موت اور حیات کی کشمکش میں تھا۔

آپ ان حالات کو سامنے رکھیے اور پھر اِس فوج کی اُس کمان کی کیفیت کا اندازہ لگائیے جس کی طرف دشمن آتش فشاں پہاڑ کی طرح بڑھے چلا آ رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کمان نے کیا فیصلہ کیا؟ بھارت کے صدر، ڈاکٹر رادھا کرشن نے اس سے چند ہی روز قبل کہا تھا کہ "سب سے بڑی مدافعت حملہ کر دینا ہے"۔ اس کمان نے کہا کہ مہاراج! آپ نے سچ فرمایا ہے۔ دیکھئے! عملی تجربہ آپ کے اس قول کی کس طرح شہادت دیتا ہے ــــ یہ کہا اور صرف دو اڑھائی سو سپاہیوں کے ساتھ، سات بجے شام، آگے بڑھ کر، دشمن کے اس جمِ غفیر پر حملہ کر دیا۔ اور دس بجے رات تک (جب دشمن نے اپنے منصوبہ کے مطابق اِن پر حملہ کرنا تھا انہوں نے) ان مورچوں پر قبضہ کر لیا جہاں دشمن نے حملہ کرنے کے لئے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ اور جب یہ وہاں پہنچے ہیں تو وہاں ہنوز ان کے چولہوں میں آگ سُلگ رہی تھی اور گرم گرم دال اور چاول کی دیگچیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا اور بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا ــــ اور اس تاریک رات میں، آسمان کے ستارے، پاکستانی فوج کی کمان کے اس حیرت انگیز، ہوش رُبا، حوصلہ آزما، وہمت طلب فیصلے، اور ان سپاہیوں کی بے مثال شجاعت اور عدیم النظیر بسالت کی داد دے رہے تھے۔ دس بجے شب، پاکستانی فوج کے چند عقبی دستے ان کے ساتھ اور آ ملے اور اب انہوں نے مدافعانہ کی بجائے جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے۔ آپ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ اتنے بڑے وسیع و عریض رقبہ پر پھیلے ہوئے محاذ پر،

چند سو سپاہی اور وہ بھی (مقابلۃً) ایسے مختصر سے اسلحہ اور سامان کے ساتھ، دشمن کی اس قدر کثیر تعداد کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکائے چلے جا رہے تھے۔ دوسرے دن شام تک یہ کئی میل آگے بڑھ چکے تھے۔ فاضلکا کا ڈمپ ان کی گولہ باری سے تباہ ہو چکا تھا۔ دشمن کے قدم کسی مقام پر بھی ٹِک نہیں رہے تھے کہ اتنے میں ان کے کان میں آواز پہنچی کہ لاہور سیکٹر میں آدمیوں کی زیادہ ضرورت ہے اس لئے آگے بڑھنے سے رُک جاؤ اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں سپاہی اُدھر منتقل کر دو۔

جو سپاہی ہم سے یہ حالات بیان کر رہا تھا، یہاں آکر اس کی آواز بھرّا سی گئی۔ اس نے کہا کہ اگر اُدھر کی ضرورت اس قدر شدید نہ ہوتی تو ہم دوسری صبح تک فیروز پور ہوتے! چنانچہ ان کے لئے اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ یہ مدافعانہ پوزیشن لیکر بیٹھ جاتے۔

ہماری جیپ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی — یہ علاقہ زمین کی زرخیزی اور چراگاہوں کی سرسبزی کے لئے بڑا مشہور ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کپاس کی خشک چھڑیاں تا بحد نگاہ کھیتوں میں کھڑی تھیں۔ معلوم ہوا کہ کپاس چن لی گئی ہے اور چھڑیاں کسی نے نہیں کاٹیں۔ اگر اس دوران میں انہیں پانی مل جاتا، تو یہ دو تین مرتبہ فصل دیدیتیں۔ لیکن جس ھندو نے ہمارا وہ پانی بھی روک لیا تھا جسے وہ معاہدہ کی رُو سے دینے کا پابند تھا، وہ اس علاقے کے لئے پانی کس طرح دے دیتا۔ اس لئے اب یہ سارا علاقہ خشک اور ویران ہو رہا ہے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ سامنے ایک بہت بڑا گاؤں آیا — زرخیز علاقوں کے گاؤں بھی اچھے خاصے قصبے ہوتے ہیں۔ پختہ مکانات۔ بڑے بڑے احاطے، کشادہ راستے۔ میں نے پوچھا کہ یہ گاؤں بھی ۷ ستمبر کو فتح ہوا تھا؟ جواب ملا کہ نہیں۔ جب ہم نے مدافعانہ پوزیشن لی ہے تو اس کے بعد ہندوؤں نے تین بار حملہ کیا کہ اپنے چھنے ہوئے علاقہ کو واپس لے لیں لیکن ہر حملہ کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا چھنا ہوا علاقہ انہیں واپس ملنا تو ایک طرف، وہ جس گاؤں سے ہم پر حملہ کرتے تھے وہ گاؤں بھی ان کے قبضہ سے چھن جاتا تھا۔ چنانچہ یہ گاؤں ہمارے قبضہ میں بعد میں آیا تھا۔

پاکستان کے جسور و غیور سپاہیو! تم پر خدا کے سحابِ کرم کی بارشیں ہوں۔ معلوم نہیں تمہارے بازوؤں میں کس قسم کی ہمت اور تمہارے سینوں میں کس انداز کے دل ہیں جو ایسے نامساعد حالات میں، یہ کچھ کرکے دکھا دیتے ہو!

ہم اسی طرح جیپ میں آگے بڑھتے گئے — یہ گاؤں چشتی محمد علی ہے۔ یہ بیری والا۔ یہ جھنگڑ، یہ بکو شاہ، یہ جنٹر والا جہاں گورکھا فوج کا دال بھات بکھرا پڑا تھا۔ یہ تو تھے گاؤں۔ اور ہر دو چار گاؤں کے درمیان، ایک ملٹری پوسٹ تھی — دوسرے علاقوں میں جو ملٹری پوسٹس ہم نے دیکھیں وہ

بس ایسی ہی تھیں جیسے مکی کے کھیت میں مچان کھڑا ہو لیکن یہاں کی ملٹری پوسٹس بالکل قلعہ نما تھیں۔ دس دس فٹ اونچے حفاظتی بند کے اندر، پختہ کنکریٹ کی نہایت مضبوط عمارت جو توپوں کے گولوں کا بھی مقابلہ کر سکے۔ اور ہر عمارت کے ساتھ بلند مینار جو دور دور تک پاسبانی کا کام دے۔ ان کی اس قسم کی پوسٹس سارے علاقے میں بکھری ہوئی تھیں اس سے اس امر کا اندازہ لگ سکتا تھا کہ بھارت کب سے ہمارے خلاف جنگی تیاریاں کر رہا تھا اور ان تیاریوں کا معیار کیا تھا۔ ہم نے ان پوسٹوں کو جا کر دیکھا۔ انہیں فتح کرنا آسان کام نہیں تھا۔ صادقیہ پوسٹ، جھنگڑ پوسٹ، کھوکھر پوسٹ۔ لبار ستماں پوسٹ، سوار والی پوسٹ، خان علی والا پوسٹ ۔ ان کے علاوہ، دریا کے اس پار بھی چار پانچ پوسٹس ہمارے قبضہ میں ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر مضبوط۔ اب یہ تمام پوسٹیں مسمار ہو چکی ہیں اور سامنے کھلا میدان ہے جہاں دشمن بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ فائر بندی کے بعد ان کی طرف سے کوئی شرارت تو نہیں ہوئی؟ اس پر ہمارا میزبان مسکرایا اور کہا کہ آپ شرارت کا کہہ رہے ہیں یہاں سب سے بڑی لڑائی فائر بندی کے بعد ہوئی ہے

"سب سے بڑی لڑائی فائر بندی کے بعد" ! یہ کیسے ؟

انہوں نے کہا کہ جب ۲۳ ستمبر کو فائر بندی کا حکم ملا تو ہمیں قدرے اطمینان ہوا اور ہم نے جوتوں کے تسمے کھولے لیکن ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ۲۴/۲۵ کی درمیانی شب، دشمن پورے ساز و سامان کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو گیا ــــ بالکل اچانک ــــ ہر قول و اقرار کے خلاف، اچانک!

میں نے مضطربانہ انداز سے پوچھا کہ پھر کیا ہوا ــــ ؟ کہنے لگے کہ دشمن کی دو کمپنیاں ختم ہوئیں، کچھ قید ہو گئے۔ اور یہ علاقہ ہمارے قبضہ میں آگیا۔ اس محاذ پر مقابلہ میں گورکھا سپاہی تھے جو بڑے جنگجو اور آہنی پیکر شمار کئے جاتے ہیں اور یہ گورکھے وہ تھے جو قسمیں اٹھا کر آئے تھے کہ ہم اپنی شکست کا بدلہ لیں گے۔

کیا بات ہے ہمارے جانباز مجاہدوں کی ــــ !

ہم قریب سو میل کا چکر لگا چکے تھے۔ دھوپ سخت تھی، دوپہر ہو چکی تھی کہ جیپ اس سمت کی طرف مڑی جدھر ہم نے دوپہر کا کھانا کھانا تھا۔ راستے میں ایک ریلوے اسٹیشن آیا جہاں فاضلکا کی سمت کی پٹڑی اکھڑی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون سا اسٹیشن ہے۔ جواب ملا ــــ امروکا ــــ جو پہلے دہلی، کراچی ریلوے لائن کا ایک اسٹیشن تھا لیکن اب پاکستان کا پہلا اسٹیشن ہے۔

## ۱۹۴۷ء کی جنگ!

• "امروکا" کا نام سن کر میرا ذہن مجھے ایک ثانیہ میں اٹھارہ برس پیچھے

لے گیا۔ اور پاکستان اور بھارت کی پہلی لڑائی کے مناظر ایک ایک کر کے میرے سامنے آتے گئے۔ یہ داستان بھی سنانے کے قابل ہے ـــــ اس لئے کہ اس کے بعد ان داستانوں کے سنانے والے نہیں رہیں گے۔ اور چونکہ (ہماری نالائقی سے) یہ داستانیں کہیں محفوظ نہیں کی گئیں اس لئے آنے والی نسلیں ان سے باخبر تک نہیں ہوں گی۔ یہ بات ہے اگست ۱۹۴۷ء کی۔

تقسیم ہند کے بعد، مرکزی حکومت کے پاکستانی عملہ اور ریکارڈ کو دہلی سے کراچی منتقل کرنے کے لئے اسی ریلوے لائن کا راستہ تجویز کیا گیا تھا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ (اور چند دیگر محکموں) کا عملہ اسپیشل ٹرین سے کراچی آنے والا تھا، جسے دہلی سے ۱۲/اگست کو روانہ ہونا تھا۔ میرے رفیق عزیز، صدیق مخلص و غمخوار فضل محمد سبحانی (مرحوم) میرے ہم سفر تھے ـــــ فضل محمد سبحانی جسے آج بھی مرحوم کہتے ہوئے دل پر نشتر سا لگتا ہے۔ ۱۱/ کی شام، اس محکمہ کے ایک ذمہ دار افیسر، جو اس نقل مکانی کے امور سرانجام دے رہے تھے، میرے پاس آئے اور رازدارانہ انداز سے کہا کہ کل جو پاکستانی ٹرین یہاں سے روانہ ہوئی تھی، فاضلکا کے قریب اس پر بم پڑا ہے۔ اب جو ٹرین صبح روانہ ہونے والی ہے، معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔ آپ اس ٹرین سے نہ جائیے۔ پرسوں سے گاڑیاں لدھیانہ ۔ جالندھر ۔ لاہور کے راستے چلیں گی۔ آپ اُس ٹرین سے جائیے۔ میں نے فوراً سبحانی مرحوم کو بلایا اور کیفیت بیان کرنے کے بعد کہا کہ کل کا جانا ملتوی کر دیا گیا ہے اب پرسوں کی گاڑی سے چلیں گے۔

اس (مرحوم) دوست نے ساری عمر یہ مسلک رکھا تھا کہ ـــــ ہمیں تو خوش ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے ـــــ اس نے کبھی (اعتراض تو ایک طرف) یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ ایسا فیصلہ کیوں کیا گیا ہے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ نہیں ـــــ ایسا نہیں ہوگا ـــــ ہمیں کل ہی جانا ہوگا۔ میں نے اسے ہزار سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ حتیٰ کہ اس نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ آپ میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیجئے۔ میں تو کل ہی جاؤں گا۔ اس کے بعد میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں ایسے دوست کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ ہم ۱۲/اگست کی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر احباب نے پُرنم آنکھوں سے ہمیں الوداع کہا۔ شام کے قریب گاڑی جیند کے اسٹیشن پر جو آئی، تو آگے چلنے کا نام نہیں لیتی۔ ڈرائیور سے پوچھا، تو اس نے بتایا کہ ہمیں جو انجن دیا گیا ہے اس کی ہیڈ لائٹ کام نہیں دے رہی اس لئے اندھیرے میں کیسے آگے چلا جائے۔

یہ تمام علاقہ سکھوں کی ریاستوں پر مشتمل تھا اور امن کے زمانے میں بھی مخدوش

سمجھا جاتا تھا۔ ڈرائیور سے جو یہ سنا تو موت سامنے دکھائی دینے لگی۔ ہم مجبور اور بے بس وہاں کھڑے تھے اور چاروں طرف وحشت و بربریت کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا ہوگا کہ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک مال گاڑی وہاں آکر رکی۔ اس کا ڈرائیور بھی حسن اتفاق سے مسلمان تھا۔ اس نے جب یہ ماجرا سنا تو اپنے انجن کی ہیڈ لائٹ یہ کہہ کر ہمیں دے دی کہ آپ کی جانیں زیادہ قیمتی ہیں۔ آپ حفاظت سے جایئے۔ مجھ پر جو بیتے گی بھگت لوں گا۔

اس زمانے کا مسلمان عملہ وفاشعاری اور جاں نثاری کا جو جذبہ لے کر آیا تھا، اسے اگر کہیں اپنی مستقل متاع بنالیا جاتا، تو نہ معلوم آج ہم کن بلندیوں پر ہوتے۔

گاڑی آگے چلی لیکن بڑی سست رفتاری سے۔ ڈرائیور سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔ کہ نیچے سے جو کوئلہ نکلا ہے وہ بڑا ناقص اور بھیگا ہوا ہے۔ اس لئے گاڑی کی رفتار تیز نہیں ہو رہی!

آپ دیکھتے ہیں کہ عین تقسیم ملک کے وقت، ہندو نے پاکستان کے خلاف کس قسم کی جنگ چھیڑ رکھی تھی!

گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ہمارے سینوں میں دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ جوں جوں فاضلکا قریب آ رہا تھا ہمارا خون خشک ہو رہا تھا۔ کہ نہ معلوم ٹرین کے ساتھ کیا ہو! آخر شب گاڑی فاضلکا پر رکی تو دور سے "بندے ماترم" ۔ "مہابیر ارجن کی جے" کے نعرے سنائی دیئے۔ ہم گاڑی میں سہمے بیٹھے تھے۔ نعروں کی آواز قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی جلدی چلا دو۔ اس نے کہا کہ گاڑی کیسے چلاؤں ــــ لائن کلیر نہیں دے رہے۔

نعرے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ سبحانی مرحوم میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جس قسم کے جذبات جھلک رہے تھے۔ ان کی یاد میں آج تک نہیں بھول سکا ــــ اپنی نہیں، میری حفاظت کی طرف سے پریشانی ــــ اپنے فیصلہ پر ندامت ــــ اور اس کے ساتھ ہر قربانی پر آمادگی ــــ میں نے کہا۔ گھبراؤ نہیں ــــ میرے پاس (تلیر مارنے والی) بندوق تھی۔ ــــ بچے سو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میں ٹرین کے باقی عملہ کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ یہ بندوق لے لو۔ اگر خطرہ کا وقت آ گیا تو اس سے بچوں کو ختم کر دینا۔ اس کے بعد ہم اطمینان کی موت مر سکیں گے نعرے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ جب ان کی آوازیں بہت ہی قریب آ گئیں تو یکایک

ہماری گاڑی سرکی اور چل پڑی ۔۔۔ معلوم نہیں کہ یہ لائن کلیئر ملے کر ہوا، یا اس کے بغیر ہی۔ تھوڑی دور آگے آئے تو دور سے مؤذن کی آواز کانوں میں پڑی ۔۔۔ اَللّٰہُ اَکْبَر۔ اَللّٰہُ اَکْبَر۔ اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ۔۔۔ اِس آواز نے ہمارے عروقِ افسردہ میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ یہ تھی ۔۔۔ وہ اذاں جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ۔۔۔ معلوم ہوا کہ اب ہم حدِ پاکستان میں ہیں۔ یہ "امروکا" کا اسٹیشن تھا۔

آج ۔۔۔ میں اٹھارہ برس اور چھ ماہ کے بعد، اسی امروکا کے اسٹیشن کے پاس ریلوے لائن پر کھڑا تھا ۔۔۔ یہ ٹرین صحیح وسلامت، بخیر وخوبی، کراچی پہنچ گئی۔ اور وہ گاڑی جو ۱۳ اگست کو دہلی سے کراچی کے لئے دوسرے راستے روانہ ہوئی تھی ۔۔۔ لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، میں اس پر کیا گزری ۔۔۔ اس کا ماجرا وہ لاشیں سناتی تھیں جو لاہور پہنچنے پر اس کے ڈبوں سے نکالی گئی تھیں۔ ہماری ٹرین وہ آخری گاڑی تھی جو صحیح وسلامت کراچی پہنچی۔

اس کے بعد، سبحانی (مرحوم) ہمیشہ فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا کرتا ۔۔۔ بعض اتفاقات کس قدر تحیر انگیز ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی ۔۔۔ اتفاق (چنانچہ) تو کہتے ہی اسے ہیں جس کی توجیہہ سمجھ میں نہ آئے۔

یہ تھا وہ ہندو جس نے ہمارے ساتھ اگست ۱۹۴۷ء سے یہ کچھ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دھماکا تو اِس آتشِ خاموش کی ایک کڑی تھی۔

میں اٹھارہ برس پہلے کے انہی تصورات میں گم تھا کہ ہماری جیپ امروکا کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئی جہاں ہم اپنے نہایت مخلص میزبان کے حسنِ تواضع سے لذت یاب ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے قریب پچاس میل اور جیپ میں سفر کیا اور اس علاقہ کے نشیب و فراز کا معائنہ اور مطالعہ کرتے ہوئے قریب سات بجے شام، واپسی کے لئے گاڑی میں سوار ہو گئے۔

اس وقت، جبکہ میں اپنے ان تاثرات کو قلمبند کر رہا ہوں، رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اگر فاضلکا سیکٹر کے وہ شکوے مجھ تک نہ پہنچتے جن کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے، تو میں اس محاذ کی معرکہ آرائیوں کی ان داستانوں سے محروم رہ جاتا جنہوں نے پاکستان کی تاریخ میں ایک زریں باب کا اضافہ کیا ہے۔

**فاضلکا سیکٹر کی فوجی کمان کے افسرو! پاکستان کی آنے والی نسلیں آپ**

(باقی صفحہ نمبر ۸۴ پر ملاحظہ

## خورشیدِ عالم

# روس کا عالمی کردار

اشتراکی انقلاب سے پہلے روس کی نظریں بالعموم ترکی، ایران اور افغانستان پر لگی رہتی تھیں کیونکہ وہ ان راستوں سے بحیرہ روم، خلیج فارس اور بحیرہ عرب تک پہنچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ ممالک روسی خطرے سے دوچار رہتے تھے۔ لیکن جن راستوں سے روس گزرنا چاہتا تھا ان پر بیشتر یورپی اقوام، بالخصوص برطانیہ کا تصرف تھا۔ اسلئے روس کی ان سے چپقلش ایک روایت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد اس کشمکش اور تصادم کی صورت بدل گئی۔ بیرونی دنیا تک پہنچنے کی بجائے روس اپنے آپ میں ڈوب گیا اور اس طرح اندر ہی اندر انقلاب کے تقاضے پورے کرنے میں منہمک ہو گیا۔ باقی دنیا سے وہ ایسا الگ تھلگ ہوا کہ ٹھیک طرح پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ اندرون روس کیا ہو رہا ہے اور انقلاب کیا رنگ لا رہا ہے۔

روس کا انقلاب ملوکیت (یعنی سیاسی استحصال)، پیشوائیت (یعنی مذہبی استحصال) اور سرمایہ داری (یعنی معاشی استحصال) کے خلاف بغاوت تھا۔ بغاوت کے اس سہ گونہ تصور نے اقوام مغرب کے دل میں روس کے خلاف پہلے سے زیادہ تعصب بھر دیا۔ چنانچہ عالمی سطح پر روس کو اچھوت سا سمجھا جانے لگا۔ روس اس سے بے نیاز درونِ در مصروف رہا۔ بتدریج اسکے ہاں استحکام پیدا ہوتا گیا اور اسکے ساتھ اس طرح کی خبریں پھیلنے یا پھیلائی جانے لگیں کہ روسی انقلاب سے خاطر خواہ نتائج مترتب ہونے لگے ہیں۔ دنیا نے پہلی بار جنگ عظیم کے دوران دیکھا کہ روس ایک عظیم طاقت بن چکا ہے۔ اس سے ایک حد تک وہ کالک دھل گئی جو اقوام یورپ نے روس کے منہ پر محض از رہ تعصب مل رکھی تھی۔ باقی کالک بہت حد تک اسلئے صاف ہو گئی کہ اتفاقاتِ تاریخ نے روس کو برطانیہ اور امریکہ کا حلیف بنا کے جرمنی کے خلاف صف آرا کر دیا تھا۔ روس جس انداز سے لڑا، اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ ترقی یافتہ ملک ہے اور

اسکے باشندے وطن کے جان نثار ہیں۔

روس کی کامیابی سے لامحالہ اشتراکیت کا چرچا ہوا۔ جنگ سے پہلے روس نے اشتراکیت کے فروغ کو اپنی قومی حکمت عملی کا نقطۂ ماسکہ بنالیا تھا بہت سے ممالک میں اس کے تصورِ معیشت کا چرچا شروع ہونے لگا تھا۔ اور جگہ جگہ اشتراکی جماعتیں معرضِ وجود میں آتی جارہی تھیں۔ ان جماعتوں کی مخالفت مقامی طور پر مغربی اثر کے تحت شدت اختیار کرچکی تھی۔ مگر جنگ میں روس مغرب کا حلیف بن گیا تو یہ مخالفت دب گئی۔ اس سے اشتراکیت مقامی تحریکوں کی شکل اختیار کرگئی اور روس کو اس کی ضرورت نہ رہی کہ وہ اشتراکیت کے عالمی فروغ کو قومی حکمتِ عملی کی اساس قرار دے۔ جنگ سے روس کو ایک فائدہ یہ بھی پہنچا کہ وہ ممالک جو آج کل مشرقی یورپ کہلاتے ہیں، اسکے قبضے میں آکر اشتراکی ہوگئے۔ جنگ کے بعد سب سے بڑا انقلاب چین میں آیا۔ وہاں اشتراکیت کی لہر اندرون ملک سے اٹھی اور روس کی مدد سے امریکہ جیسے عظیم ملک کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ چینی رستاخیز نے اشتراکی انقلاب کے محرکات کو واضح اور اس کے مضمرات کو مشہود کردیا۔ یہاں سے اس تاریخی تضاد کی طرح پڑی جس نے عالمی سیاست کو شطرنج کی وہ بازی بنادیا ہے کہ جس کی نہ بساط تہ کی جاسکتی ہے اور نہ اسے کھیلا ہی جاسکتا ہے۔ اس میں شکست تنہا ہارنے والے ہی کی تباہی کا موجب نہیں ہوگی۔ بلکہ انسانی زندگی تک کو کرۂ ارض سے ختم کردینے کی ذمہ دار بھی بن سکتی ہے۔ کیونکہ چین سے امریکہ کی براہ راست لڑائی ایٹمی لڑائی بنے بغیر نہیں رہ سکتی۔

روس کے عالمی کردار کو سمجھنے کے لئے چینی انقلاب کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ چین میں چیانگ کائی شیک کی حکومت رجعت پسندانہ اور مفاد پرستانہ انداز اختیار کرگئی تو چین کے اندر سے اسکے خلاف بغاوت ابھری۔ یہ بغاوت برسرِ اقتدار طائفہ کے سیاسی اور معاشی استحصال کے خلاف تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ روس کی مثال اور مدد کی بدولت یہ بغاوت اشتراکی ہوگئی۔ چنانچہ گو مقابلہ چینی حکومت اور چینی اشتراکیت میں تھا، یہ حقیقت ہے کہ چین میں روس اور امریکہ لڑے اور امریکہ نے بالآخر منہ کی کھائی۔ امریکی انا اس شکست کو آج تک تسلیم نہیں کرسکا۔ اس کا ثبوت یہ طفلانہ مگر از صد خطرناک حرکت ہے کہ وہ فارموسا جیسے حقیر جزیرے کو چین کہنے اور کہلانے لگ گیا۔ کوریا، ویٹ نام، بھارت بلکہ پورے ایشیا میں وہ چین ہی کیخلاف لڑ رہا ہے۔

امریکہ اور چین تو خیر برسرِ پیکار تھے، اسلئے وہ ایک دوسرے کے حریف بنے اور ہیں۔ لیکن روس اور چین بھی زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے حلیف نہیں رہ سکے۔ حالانکہ ان کا عالمی مفاد ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا متقاضی ہے۔ ان میں اختلافات کی نوعیت بنیادی ہوگئی کیونکہ تصوراتی طور پر بھی وہ ایک ہی اشتراکی تعبیر پر متفق نہیں رہ سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ روس اشتراکی نظام کے قیام کے ابتدائی مراحل

سے گزر کر معاشی ترقی کے ان منازل میں داخل ہو چکا ہے۔ جہاں اقدام مدافعت میں بدل جاتا ہے اور عمل کا پیمانہ مفاد کا تحفظ بن جاتا ہے۔ چین کو ابھی ان مراحل سے گزرنا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ چین ترقی کر کے اور روس کا ہم پلہ ہو کر بھی اشتراکیت کی روسی تعبیر نہ اپنا سکے۔ اُسے تاریخ نے جو تشخص عطا کر دیا ہے وہ روس کو یقیناً حاصل نہیں۔ مزید برآں چین سفیہانہ روز محنت سے اتنی جلدی عالمی طاقت بن گیا ہے کہ بین الاقوامی میدان میں اُسے نظر انداز کرنا اور ایشیا میں اسکے اثر کو روکنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ امریکہ ایشیا کو اپنا دائرۂ اثر سمجھتا ہے اس نے یورپی استعمار کی گھسی کھڑاویں پہن کر یہ فرض کر لیا ہے کہ ایشیا کے تخت کا وارث وہی ہے۔ اس کے مفروضے اور دعوے کو اشتراکیت نے للکارا لیکن اشتراکیت کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ اس کی قیادت کا سرچشمہ پیکنگ ہے یا ماسکو۔ جوں جوں روس اور چین میں تصوراتی اختلافات بڑھتے گئے دیگر ممالک کی مقامی اشتراکی جماعتوں میں ماسکو اور پیکنگ میں تقسیم کے خطوط واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔

اشتراکی محاذ پر اس پھوٹ کو دیکھ کر امریکہ میں گھی کے چراغ جلائے جانے لگے۔ اس پھوٹ سے موقع پا کر امریکہ نے روس کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ روس کو اپنے ساتھ ملانے میں امریکہ کی مصلحت ظاہر رہا ہے وہ روس کی طرف سے بےفکر ہو کر اور یورپ کے محاذ سے ہٹ کر اپنی تمام تر توجہ چین پر مرکوز کرنا چاہتا ہے تاکہ آنے والی عالمگیر جنگ کا محاذ ایشیا، بالخصوص چین بنے۔ اور وہ اپنے اس دیرینہ حریف پر سارا غصہ نکال لے۔ روس کہیں کہیں امریکہ کا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے چین نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ امریکہ کا ساتھی بن گیا ہے لیکن ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ بین الاقوامی میدان میں امریکہ اور روس کی راہیں ایک ہو گئی ہیں۔ ان کی سمت ایک بھی ہو تو راہیں ابھی متوازی ہیں۔ گویا دونوں کے تعلقات اس نہج پر آ گئے ہیں کہ انہیں دوستی کے آئینے میں دیکھا جائے تو رقیب نہ نظر آئیں اور رقابت کے آئینے میں دیکھا جائے تو دوست نہ نظر آئیں۔ یہ صورت وقتی طور پر دونوں کے لئے ہے کیونکہ دونوں ہمہ گیر تباہی کے ایسے آلات بنا چکے ہیں کہ وہ انہیں استعمال کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس احساس نے دونوں کے مابین ایک "میزانِ خوف" کھڑی کر دی ہے اور دونوں کو ایشیا کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ امریکہ چین کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔ اور روس امریکہ اور چین دونوں کا۔ روس جس حد تک امریکہ کا راستہ روکتا ہے اس حد تک وہ چین کا حلیف ہے، اور جس حد تک چین کا راستہ روکتا ہے اسی حد تک وہ امریکہ کا حلیف ہے۔ لیکن چونکہ ایشیا میں عام رائے استعمار، فلہذہ امریکہ، کے خلاف ہے۔ اسلئے تصادم استعماریت اور اشتراکیت کے درمیان ہے۔ اشتراکیت اور اشتراکیت یعنی روس اور چین کے درمیان نہیں۔ گویا ایشیا کے میدان میں روس کے آ جانے سے بالواسطہ زور امریکہ پر پڑ رہا ہے نہ کہ چین پر۔ چین بیک وقت پس منظر بھی ہے اور پیش منظر

بھی، یعنی وہ غائب بھی ہے اور حاضر بھی۔ ایشیائی صورت حال کے یہ ناگزیر تفاوات زیادہ تر چین کے حق میں جاتے ہیں۔ روس کا فائدہ ضمنی ہے اور امریکہ کا اس میں سراسر نقصان ہے۔

ایشیا میں تصادم کے مقامات (چین کے بعد) کوریا اور سابقہ ہند چینی بنے۔ اور اب تک ہیں۔ تاہم چین کے اشتراکی ہو جانے کے بعد اشتراکیت کا دھارا نمایاں طور پر ہمارے برصغیر کی طرف بہنے لگا۔ اور صاف دکھائی دینے لگا کہ اس کا رخ بھارت کی طرف ہے۔ محل وقوع اور وسعت رقبہ کے لحاظ سے بھارت قابل قسم نشانہ تھا ہی۔ لیکن نہروانی سیاست نے اس دھارے کا رخ خاص طور پر اپنی طرف موڑ لیا۔ پنڈت نہرو امریکہ چین اور روس سے روابط پیدا کر کے دنیا بھر کو جتانے کی یہ منافقانہ سعی کرتے رہے کہ بھارت غیر جانبدار ہے اور قیام امن کا داعی ہی نہیں اس کا ضامن بھی ہے۔ تنگی کے اس ناچ سے بھارت اپنے لئے جو عالمی حیثیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا وہ صحیح حقدار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے چین سے مخاصمت کی بنا ڈالی۔ اس نے دیکھ لیا کہ امریکہ چین کے بغض میں اس کا ساتھ دے گا۔ اور روس بھی ایک حد تک چین کی مخالفت میں اور ایک حد تک امریکہ سے مسابقت کے خیال میں اس کا ساتھ دے گا۔ اس طرح بھارت اور چین میں کشیدگی کا دور دورہ ہو گیا۔ اور بھارت کی امداد کے لئے امریکہ اور روس دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔

روس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھارت میں وہی نقشہ مترتب ہو رہا ہے جو چین میں اشتراکی انقلاب کا موجب بنا۔ اسے یقین ہے کہ بھارت میں امریکہ کی آمد اور موجودگی کو بھارتی قیادت ابتدا میں پسند ہی کیوں نہ کرے، بتدریج امریکہ تنقید کا نشانہ بنتا جائے گا اور خلاف استعمار رائے اندرون بھارت اشتراکیت کے فروغ کا باعث بن جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح چین میں ہو چکا ہے۔ گویا روس بھارت میں بھارتی حکومت کی مدد نہیں کر رہا بلکہ اشتراکیت کا بیج بو کر اس کی آبیاری کر رہا ہے۔ دنیا کچھ ہی کیوں نہ کہے وہ اس پودے کو پروان چڑھانے کے لئے بھارت میں موجود رہنا چاہتا ہے۔

چین کی مثال امریکہ کے سامنے ہے اور اسکے دل میں واقعی یہ ڈر ہے کہ کہیں بھارت کا انجام بھی چین کا سا نہ ہو جائے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ جب تین سال قبل بھارت نے چین پر چڑھائی کر دی تھی۔ اور امریکہ نے ساز و سامان جنگ دلوانہ وار ہمالیہ کے اس جانب ڈھیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو وہ روس کی فوجی امداد سے ایک حد تک اسی لئے پریشان ہو گیا تھا۔ کہ دوستی کے پردے میں بھارت میں موجود رہ کر روس امریکہ کے فوجی رازوں سے باخبر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی مفر نہیں تھا۔ یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ چین کے ایک طرفہ جنگ بند کر دینے کے بعد امریکہ نے اپنے عالمی فوجی اڈوں سے بھارت کو منسلک کرنے کا جو منصوبہ بنایا اس کی وجوہات جو بھی ہوں، ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح اس کے دفاعی منصوبے روس کی

نظروں سے اوجھل رہ سکیں گے۔ دیکھا جائے تو امریکہ اس ڈر کے باوجود مجبور ہے۔ کہ بھارت میں روس کا خیر مقدم کرے۔ وہ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالنا چاہتا ہے۔ کہ روس یورپ میں اس سے ترک عداوت کر چکا ہے، خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو، اور یہ نتیجہ بھی نکالنا چاہتا ہے اور روس چین کیخلاف اس سے اشتراک کر رہا ہے گویا وہ دل میں روس سے ڈرتے ہوئے بھی بھارت میں اُسے مدعو کرنے اور اس کا استقبال کرنے پر مجبور ہے اس مجبوری کی ایک بڑی وجہ بھارت کی طرف سے بھی پیدا ہو گئی ہے۔ بھارت اپنے آپ کو غیر جانبدار کہتا چلا آرہا ہے۔ یہ دعویٰ کس قدر منافقانہ ہے۔ اسکی قلعی اس سے کھل جاتی ہے کہ وہ امریکہ کی جنگی چوکی بن گیا ہے۔ افریشیائی برادری اُسکے اس کردار کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ افریشیائی رائے کو دھوکہ دینے کے لئے روس کو پکڑ پکڑ کر اپنے ہاں لاتا اور بٹھائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی غیر جانبداری کا بھرم اسی طور پر قائم رہ سکتا ہے کہ روس اس کا ساتھ دے۔ روس امریکہ اور بھارت دونوں کی اس بنیادی مجبوری کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے وہ دونوں پر احسان بھی دھر رہا ہے اور اپنا راستہ بھی ہموار کر رہا ہے۔ تصوراتی اعتبار سے وہ چین کا کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو، سیاسی طور پر وہ چین کے پوری طرح مخالف نہیں ہوا۔ کم از کم اعلانیہ وہ چین کی مخالفت نہیں کرتا وہ کر بھی نہیں سکتا۔ کوریا میں روس وہی رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہے جو چین کا ہے، ویٹ نام میں وہ اعلانیہ طور پر امریکہ کیخلاف فوجی اور معاشی مدد دے رہا ہے۔ گویا وہاں بھی وہ چین ہی کی حکمت عملی پر کاربند ہے ـــ ویٹ نام میں امریکہ کا حریف بن کر روس بھارت میں امریکہ کا حلیف نہیں بن سکتا۔ بھارت میں جو مواد پک رہا ہے وہ پھوٹ کے رہے گا۔ اور جب وہ وقت آئے گا تو بھارت بھی تماشہ دیکھیگا اور امریکہ بھی امریکہ اپنے آپ کو یہ دھوکہ دے رہا ہے کہ چین کیطرح بھارت میں امریکہ اور روس ایک دوسرے کیخلاف صف آراء ہو جائینگے چنانچہ وہ اس کے لئے کوشاں ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روس اور چین میں کشیدگی بڑھتی جائے تاکہ بالآخر بھارت میں امریکہ اور روس چین کیخلاف متحد ہو کر لڑیں۔ اسکی خواہش اور کوشش اپنی جگہ لیکن وہ طاقت کے بل بوتے پر یا سیاسی چالوں سے واقعات کا رخ نہ پہلے موڑ سکا ہے نہ اب موڑ سکے گا۔

پاکستان میں روس کے عالمی کردار کے تعاون پر بالعموم حیرت کا اظہار تو کیا جاتا ہے۔ لیکن اسکو صحیح پس منظر میں دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کم کیجاتی ہے۔ اسکا نتیجہ ہے کہ دونوں ممالک کے تعلقات طویل عرصہ تک کشیدہ رہے۔ اور اب جب ان میں استواری آنے لگی ہے تو اسکی رفتار خاطر خواہ نہیں۔ پاکستان کا رخ، بھارت کی طرح، ابتداء سے مغرب کی طرف تھا۔ البتہ بھارت نے غیر جانبداری کا ڈھونگ کھڑا کر کے دونوں عالمی بلاکوں میں اپنی ساکھ بنالی اور خوب ہاتھ رنگے۔ پاکستان مجبور تھا کہ معاشی اور عسکری مدد کے لئے مغرب کی طرف رجوع کرتا۔ وہ پہلے برطانیہ سے اور پھر امریکہ سے امداد کا طالب ہوا۔ جب امریکہ کی طرف مڑنے لگا۔ تو اسکی گنجائش پیدا ہو گئی

تھی کہ وہ روس سے بھی تعلقات پیدا کر لیتا۔ لیکن پاکستان کے پہلے وزیراعظم روسی دعوت کے باوجود ماسکو جانے میں متذبذب رہے۔ اسکے بعد امریکہ سے تعلقات کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہو گئی کہ پاکستان یکسو ہو گیا اور اس نے مشرق یعنے چین یا روس سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ سیاسی تعلقات تو ایکطرف رہے تجارتی تعلقات بھی دونوں ملکوں میں برسوں قائم نہ ہو سکے۔ امریکہ سے اس قسم کے تعلقات قائم کرنے میں ایک حد تک پاکستان حق بجانب تھا اول تو جنگ کے فوراً بعد روس اس قابل نہیں تھا کہ وہ پاکستان کی معاشی اور عسکری ضرورت پوری کر سکتا۔ دوسرے روس اصولاً اشتراکی ممالک کو ہی امداد دینے کا قائل تھا۔ وہ ان ممالک کو مدد نہیں دینا چاہتا تھا جہاں غیر اشتراکی نظام رائج تھا۔ روس کے نظریئے میں تبدیلی کئی سالوں کے بعد آئی اور جب یہ تبدیلی آئی تو پاکستان بہت دور ہو چکا تھا۔ بھارتی غیر جانبداری نے بھی منافقت کے باوجود پاکستان کا راستہ روک دیا تھا۔

پاکستان امریکہ کی خلاف اشتراکیت دفاعی تنظیموں میں شامل ہو گیا تو وہ روس کی رہی سہی ہمدردی بھی کھو بیٹھا۔ اسکا ثبوت کشمیر میں ملا جسے روس نے بھارت کا حصہ قرار دیا۔ گو ۱۹۵۵ میں روس نے کشمیر کو بھارت کا حصہ قرار دیا اور بعد میں سلامتی کونسل میں اسنے بھارت کے لئے حق استرداد بھی استعمال کیا لیکن اس نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ وہ پاکستان کا دشمن ہے یا اس سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روس کے اس رویئے سے پاکستان کو نقصان پہنچا لیکن روس جو کچھ کر رہا تھا وہ بلاوجہ نہیں تھا۔ وہ ہمارے نزدیک یا ہمارے لئے درست نہیں تھا لیکن اسکے نزدیک بالکل معقول اور حق بجانب تھا۔ روس انتہائی رویہ اختیار کر کے ــــ یعنی ایک طرف کشمیر کو بھارت کا حصہ کہہ کے اور دوسری طرف پشاور کے گرد دائرہ کھینچ کے اسے تباہ کر دینے کا اعلان کر کے ــــ جہاں بھارت کو پوری طرح اپنا ممنون بنا لینا چاہتا تھا وہاں پاکستان کو جتانا چاہتا تھا کہ امریکہ کی دوستی اور روس کی دشمنی میں اس کے لئے کون سا انتخاب سودمند رہے گا۔ یہ حقیقت تعجب انگیز ہی سہی لیکن اپنی جگہ اہم ہے کہ پاکستان کے بارے میں اتنا مخالفانہ رویہ اختیار کرنے کے باوجود روس نے ہمیشہ پاکستان سے خوشگوار تعلقات قائم کرنیکی خواہش کا اظہار کیا۔ دراصل وہ بھارت اور پاکستان دونوں کی امریکہ سے وابستگی ختم کرنا چاہتا تھا اقوام متحدہ میں بھی اس کا یہی کردار رہا۔ ہر بین الاقوامی معاملے میں اسکی یہی کوشش رہی ہے کہ کوئی معاملہ اقوام متحدہ میں رہے تو سلامتی کونسل میں رہے کیونکہ وہاں اسے حق استرداد حاصل ہے۔ وہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل تک کو سلامتی کونسل کے ماتحت رکھنے پر مصر رہا۔ اس نے بار بار اور برملا کہا کہ سیکرٹری جنرل کو اپنے حال پر رہنے دیا گیا تو وہ امریکہ کا پٹھو بن جائیگا۔ کشمیر میں جب وہ بار بار یہ کہتا تھا کہ بھارت اور پاکستان اس قضیئے کو براہ راست مذاکرات سے حل کریں تو اسکا مقصد یہی ہوتا تھا کہ وہ اس تنازعہ کو اور اس کے ساتھ بھارت اور پاکستان کو اقوام متحدہ لہذا امریکہ کے اثر سے نکالے حق استرداد کے استعمال سے گو فائدہ بھارت ہی کو

پہنچا لیکن ایسا کرنے سے روس کا مقصد یہی تھا کہ معاملے کو اس حد تک اپنے قابو میں رکھے کہ امریکہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کر سکے یا اس تنازعہ میں کوئی مؤثر کردار ادا کر کے دونوں ملکوں کی ہمدردیاں نہ حاصل کر لے۔ اگر روس واقعی کشمیر کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھتا جیسا کہ اسکے بیانات سے ظاہر ہوتا رہا، تو وہ کبھی یہ موقف اختیار نہ کرتا کہ پاکستان اور بھارت اس مسئلے کو براہ راست طے کر لیں۔ اسنے جو رویہ بھی اختیار کیا وہ اس خیال سے کیا کہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی وساطت سے اور امریکہ کے زیر اثر طے نہ ہو تاکہ برصغیر میں امریکہ کا اثر و رسوخ نہ بڑھے۔ روس کے قول و فعل میں تضاد کی وجہ یہی ہے کہ وہ بہر طور امریکہ کو بے دخل کرنا چاہتا تھا۔

روس کشمیر کے بارے میں جو رویہ اختیار کئے چلا آرہا تھا اسکا کمال مظاہرہ تاشقند کانفرنس ہے۔ تاشقند کانفرنس روس کی روش کا منطقی نتیجہ ہے۔ پاکستان اور بھارت کو تاشقند میں مدعو کر کے اور کانفرنس منعقد کرا کے اسنے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ امریکہ اور اقوام متحدہ نے کشمیر کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا اسکا نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلا۔ وہ شروع سے یہی کہتا چلا آرہا تھا کہ یہ تنازعہ استعماری قوتوں کا پیدا کردہ ہے اور وہی اسے زندہ رکھے ہوئے ہیں کیونکہ اسی طرح اُن کی مطلب براری ہوتی ہے۔ وہ یہ تاثر پیدا کرنے میں بھی کامیاب نظر آتا ہے کہ روس کی دلچسپی کشمیر میں خدا واسطے کی ہے یعنی وہ بغیر کسی کی طرفداری کئے یہ چاہتا ہے کہ اس علاقے میں امن قائم ہو۔ ایک حد تک کہا جا سکتا ہے کہ روس واقعی یہ چاہتا ہے کہ کشمیر میں امن قائم ہو کیونکہ کشمیر کا تنازعہ ختم ہو جائے تو امریکہ کے لئے ایک بہانہ ختم ہو جائیگا۔ جسکی وجہ سے وہ برصغیر کے معاملات میں دخیل ہوتا رہا ہے۔ روس پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تاشقند میں وہ کشمیر کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا اسے وہ اپنی بڑی کامیابی اور خلوص نیتی کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ روس اپنی طرف سے کوئی حل مسلط نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو ایسی فضا قائم کرنا چاہتا ہے جسمیں تنازعہ کا متفقہ حل تلاش کیا جا سکے یہاں آکر سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس اسکے بعد کیا کریگا۔ اسکا روشن پہلو یہ ہے کہ روس اپنے مصالح کے تحت پوری کوشش کرے کہ مسئلہ پھر سے اقوام متحدہ یا امریکہ کے ہاتھوں تک نہ جا پہنچے بلکہ اپنی نگرانی میں اسکا ایسا حل تلاش کرا لے جسے مقدمے کے تمام فریق قبول کر لیں۔ وہ ایسا کر لے تو اس علاقے میں اسکا اثر و رسوخ بہت بڑھ جائیگا۔ اور جتنا اسکا اثر بڑھیگا اتنا امریکہ کا اثر کم ہوگا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھارت کی ضد کی وجہ سے مسئلہ تو حل نہ ہو لیکن روس اپنے وقار کی خاطر کشمیر کو پھر سے اقوام متحدہ میں لیجانے نہ دے یہ دلیل اپنی جگہ اہم ہے کہ اعلان تاشقند کے گواہ کی حیثیت سے یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سلامتی کونسل میں حق استرداد استعمال کر کے تصفیہ کی کوششوں کو ناکام بنائے لیکن یہ بالکل ہو سکتا ہے کہ وہ کشمیر کے اقوام متحدہ میں لیجانے کے حق میں نہ ہو تو یہ دھمکی دیدے کہ اسکی مرضی کیخلاف کشمیر کو اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا تو وہ حق استرداد استعمال کریگا۔ یہ ضروری نہیں کہ روس ایسا رویہ اختیار کرے لیکن اسکے امکان کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ہوگا یا نہیں اور ہوگا تو اس کا تدارک کیا ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب کا دارومدار اس پر ہوگا کہ پاکستان روس کے عالمی کردار کو سمجھنے اور اسکے تقاضوں سے نپٹنے کی کس قدر استعداد رکھتا ہے۔

بچوں کا صفحہ

سلمیٰ پرویز

# میں نے چھمب اور جوڑیاں میں کیا دیکھا؟

جب سے باباجی چھمب جوڑیاں سے واپس آئے، وہ اکثر ہمیں وہاں کی باتیں سناتے رہتے۔ جوں جوں وہ باتیں سناتے، چھمب جوڑیاں دیکھنے کا شوق بڑھتا جاتا۔ شوق کی اس شدت نے ارادے کی شکل اختیار کر لی اور ارادے کی پختگی ایک دن عمل بن گئی۔ چنانچہ ۸ جنوری کی صبح تاروں کی چھاؤں میں، ہمارا قافلہ اس سمت روانہ ہو گیا۔ یہ قافلہ جو قریب قریب بیس افراد پر مشتمل تھا۔ (بظاہر) بڑا ان مل اور بے جوڑ سا تھا۔ اس میں ہم بچیاں بھی تھیں اور ہمارے ساتھ ہماری مائیں، خالائیں اور پھوپھیاں بھی۔ لیکن تجربے نے بتایا کہ جب مقصد ایک ہو اور جذبات یکساں، تو عمروں کے فاصلے بہت سمٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ سارا سفر بڑی ہی باتمیز بے تکلفی میں کٹا۔ ہمارا قافلہ بارہ بجے کے قریب چھمب کی اس عمارت کے سامنے تھا جو پہلے بچوں کا اسکول تھا اور اب فوجی بھائیوں کا ہسپتال ہے۔ ہسپتال کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اتنے مختصر سے سامان کے ساتھ، ایسے وسیع پیمانے پر زخموں اور بیماروں کا علاج کیسے ہوتا ہوگا لیکن ہمیں بتایا گیا کہ فوج کے قابل ڈاکٹر اسی سامان (یا بے سروسامانی) سے بڑے سے بڑے اپریشن کر دیتے ہیں۔ فوجیوں کی ہر ادا نرالی ہوتی ہے۔

ہسپتال میں ایک سپاہی بستر پر لیٹا تھا جس کا ہاتھ زخمی تھا — اس کی عمر کے متعلق بس یوں کہیئے کہ اس کا ایک پاؤں جوانی کے ساحل پر اور دوسرا ابھی تک لڑکپن کے "کیچڑ کادھے" میں تھا۔ ہم نے اپنے فوجی گائیڈ سے

پوچھا کہ اب تو لڑائی نہیں ہو رہی، اس کا ہاتھ زخمی کیسے ہوگیا؟ ہمارے اس سوال پر اس زخمی سپاہی کے چہرے پر کچھ اس قسم کی شرمیلی تمتماہٹ پیدا ہوئی جس کی وجہ ہم قطعاً نہ سمجھ سکے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ اس سے اپنی رائفل صاف کرتے ہوئے گولی چل گئی تھی۔ اور یوں اس کا ہاتھ زخمی ہوگیا ہم نے جب پھر اس زخمی کی طرف نگاہ کی تو وہ ندامت کے مارے چادر میں منہ لپیٹ چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جو نوجوان اپنی غلطی کا اس طرح اعتراف کرتا ہے اور اُسے احساس ندامت اس شدت کا ہے وہ اپنی ڈلیوٹی کس دیانت داری سے دیتا ہوگا؛ سپاہی کی جگہ اگر فلسفی ہوتا تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ کسی طرح الزام رائفل کے سر تھوپ دیا جائے۔

تھوڑی دور آگے جاکر ہم نے ہندوؤں کے مورچے دیکھے۔ وہ بمشکل ایک ایک فٹ چوڑے تھے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ان کے سورما سپاہی کس تن و توش کے مالک ہوں گے! بھوکوں مرنے والی قوم کے سپاہیوں کا جسم اس سے زیادہ چوڑا کیسے ہوسکتا ہے۔ ایک جگہ دیکھا کہ اُن کا پیچھے چھوڑا ہوا ایک جوتا پڑا ہے۔ اس سے مجھے "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی" یاد آگئی ایک جگہ ایک ٹوٹے ہوئے ٹینک کے کے قریب کچھ اوزار پڑے تھے۔ اندازہ ہوا کہ ان کا کوئی "بہادر نوجوان" ٹینک مرمت کر رہا ہوگا۔ بھگدڑ جو مچی تو نہ ٹینک کی سدھ بدھ رہی، نہ اپنے اوزاروں کی۔ اپنی جان کی فکر پڑی اور اٹھ بھاگا۔

ہم نے دیکھا کہ ہندوؤں کے مندر ہر جگہ صحیح سلامت حالت میں کھڑے تھے۔ ہم نے فوجی بھائیوں سے پوچھا کہ جب ہندوؤں نے ہماری مسجدوں کو شہید کر دیا ہے تو آپ نے ان کے مندروں کو کیوں نہیں تباہ کیا سنیئے کہ انہوں نے کیا جواب دیا۔ کہنے لگے کہ ہمارے خدا کا حکم ہے، کہ کسی قوم کی پرستش گاہ کو مت تباہ کرو۔ اسلئے ہم انہیں کسطرح منہدم کرسکتے تھے۔؟ یہ جواب ایک ان پڑھ سپاہی کی زبان سے سن کر ہمیں اپنے سوال پر ندامت ہوئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا کہ اے کاش! ہمیں اپنے سکولوں میں کوئی اسلام کی

اتنی سی بات ہی بتانے والا ہو۔

اسی طرح ہم نے ایک اور اسکول کی عمارت کو صحیح و سلامت دیکھ کر ان سے پوچھا کہ آپنے اس عمارت کو کیوں محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ جواب ملا کہ اس لئے کہ اُن کے بچے آئینگے، تو پڑھیں گے کہاں؟ ہم نے کہا کہ آپ کو اُن کے بچوں سے کیا واسطہ؟ کہنے لگے کہ اس جنگ میں بچوں کا کیا قصور تھا۔ انہوں نے جنگ نہیں لڑی۔ اس لئے انہیں اس کی سزا کیوں ملے، ان کی تعلیم میں ہرج نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ سن کر ہم خفیف تو بہت ہوئے لیکن ہم میں ایک فلسفہ کی اسٹوڈنٹ بھی تھی۔ اس نے کہا کہ یہی بچے تو بڑے ہوکر ہمارے ساتھ جنگ کریں گے۔ اور سپاہی نے جواب دیا کہ اتنے میں ہمارے بچے بھی جوان ہو جائیں گے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔

جوڑیاں کا قصبہ بالکل ویرانہ تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کی دکانوں اور مکانوں میں بڑا قیمتی سامان تھا۔ ہم نے سپاہیوں سے پوچھا کہ کیا آپ نے بھی اس میں سے کچھ اپنے لئے رکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر اللہ کا سپاہی بھی غنیمت کا مال لوٹنے لگے تو پھر اس میں اور ڈاکو میں فرق کیا ہے؟ ان کے اس جواب سے بڑے تو ایک طرف، ہم بچیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ دل نے کہا کہ یہ ہے ہماری فوج کی حیرت انگیز کامیابی کا راز۔

جوڑیاں کی مسجد میں پہنچے تو اگرچہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا۔ لیکن ہم نے اس سعادت سے محروم نہ رہنا چاہا اور مسجد میں نفل پڑھے۔ ہمارے فوجی بھائیوں نے کہا کہ آپ پہلی عورتیں ہیں جنہوں نے یہاں آکر نماز پڑھی ہے۔

اس مسجد کو سپاہیوں نے دلہن بنا رکھا ہے۔ ہم نے کہا کہ اگر ہمیں چھمب جوڑیاں کا علاقہ چھوڑنا پڑا تو ہندو اس مسجد کو پھر خراب کر دیں گے۔ کہنے لگے کہ وہ خراب کر دینگے تو ہم پھر آکر اسے درست کرلیں گے اُس قوم پر خدا کا عذاب اسی لئے تو آتا ہے کہ وہ اس کی عبادتگاہوں کی بے حرمتی کرتی ہے۔ وہ جب بھی ایسا کرے گی اس پر اسی طرح خدا

کا عذاب نازل ہو جائے گا جس طرح پچھلی جنگ میں ان پر عذاب نازل ہوا تھا ـــــ ایمان بھی انسان کے اندر کس قدر خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے

ہم نے ہوائی جہازوں کو گرانے والی ایک توپ کے قریب ایک مسکین صورت سے فوجی بھائی کو دیکھا۔ ہمارے گائیڈ نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے! یہ وہ بہادر جوان ہے جس نے اس توپ سے دشمن کے کئی ہوائی جہاز گرائے تھے اور جس کی وجہ سے اسے هلالِ جرأت کا امتیازی نشان ملا ہے ـــــ وہ یہ کہہ رہا تھا، اور نوجوان خاموش کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی لیکن اسکا سر نیچے جھک رہا تھا ـــــ کس قدر بے ساختہ تھا بارگاہِ خداوندی میں اس کا یہ سجدۂ شکرانہ ـــــ وہ سجدہ جس پر ہماری دکھاوے کی ہزار نمازیں قربان ہوں۔

مکینوصر میں ہم نے ایک میجر سے پوچھا کہ جب آپ لوگ جنگ کی اگلی صفوں میں ہوتے تھے۔ تو آپ کو کیسے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی فتح ہو رہی ہے یا پسپائی! اس نے ہنس کر کہا کہ جب ہمیں گرم گرم اُبلی ہوئی دال ملتی تھی تو ہم سمجھ لیتے تھے کہ ہماری فتح ہوئی ہے۔ اِس پر سارا کمرہ قہقہہ سے گونج اٹھا ـــ لیکن میرے خیال میں میجر صاحب ہنسی ہی ہنسی میں وہ بات کہہ گئے تھے جس میں جنگ کی شدت اور سپاہی کی بلند ذہنیت کا مطالعہ کرنے کے لئے بڑا ہی وافر سامان تھا ـــــ سپاہی کی خوشی اور غم کے پیمانے ہم سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں!

ایک جگہ ہمیں پیاس لگی۔ جو پانی سامنے آیا وہ ذرا گدلا تھا۔ پینے کو جی نہ چاہا۔ تو ایک صوبیدار صاحب نے کہا کہ بیٹھو! ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی صاف پانی منگاتا ہوں۔ ہم نے کہا کہ آپ پانی منگائیے نہیں۔ ہمیں جگہ بتا دیجئے۔ ہم خود جاکر پی لیں گی۔ کہا کہ تم وہاں کیسے جاؤگی۔ وہ جگہ تو یہاں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے! اللہ اکبر! وہ ہماری خاطر پانچ چھ میل کے فاصلہ سے پانی منگا رہے تھے۔ نہ ہوا لاہور کا مہذب شہر جو اس قسم کی ہچکچاہٹ پر جھٹ سے جواب ملتا کہ "ابھی ہی نازک مزاجی تھی تو گھر سے

باہر تشریف ہی کیوں لائیں۔ پہلے معلوم ہوتا تو آپ کے لئے کوکا کولا کی فیکٹری لگوا دیتے۔"

ہم نے اس سے پہلے سپاہیوں کو کبھی نزدیک سے دیکھا نہیں تھا۔ جو کچھ کتابوں میں پڑھا تھا یا لوگوں سے سن رکھا تھا اس سے دل پر اس قسم کے تاثرات تھے کہ سپاہی بڑے وحشی غیرمہذب، اکھڑ، تندخو، بدمزاج ہوتے ہیں۔ لیکن اس دن جو سپاہیوں کو نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس سے بالکل الگ قسم کے انسان ہیں ہم دن بھر ان کے ساتھ رہے۔ ان سے کھل کر باتیں کیں۔ ہنسی مذاق بھی کیا۔ پہاڑیوں پر، وادیوں میں، جنگلوں میں ان کے ساتھ رہے۔ خندقوں اور مورچوں تک کی تنہائیوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ان میں ان کے اوفیسرز بھی تھے اور عام سپاہی بھی۔ اس سارے دوران، کیا مجال کہ ان میں سے کسی کی زبان سے ایک حرف بھی بدتمیزی کا نکلا ہو یا کوئی حرکت یا خفیف سا اشارہ بھی ناشائستگی کا اُبھرا ہو۔ اُن میں شگفتگی اور خوش مذاقی بھی تھی، لیکن اس قدر پاکیزہ کہ اُس کی آب سچے موتیوں سے بھی زیادہ شفاف تھی۔ ان کے ساتھ ان جنگلوں میں پھرتے وقت ہمیں وہ اطمینان اور سکون نصیب تھا جس سے ہم مہذب بستیوں کے ڈرائنگ روم میں بھی محروم ہوتے ہیں ــــ میں دن بھر سوچتی رہی، کہ ایک یہ دنیا ہے اور ایک وہ دنیا جس میں ہر صبح، ہم بچیوں کو اسکول یا کالج بھیجنے اور وہاں سے گھر آنے کا مسئلہ ہمارے ماں باپ کے لئے سوہانِ رُوح بنا رہتا ہے اور ہم سارا راستہ یوں ڈری، سہمی، چلتی ہیں جیسے ہر قدم پر کسی سانپ کے ڈسنے یا بھیڑیئے کے جھپٹنے کا خوف ہو۔ یہ تاثرات لئے ہم شام کو واپس لوٹے۔ ہمارے یہ فوجی بھائی ــــ جو ہمیں اب فی الحقیقت اپنے باپ اور بھائی نظر آتے تھے ــــ موٹروں تک ہمارے ساتھ آئے۔ اور نہایت سکون سے خدا حافظ کہہ کر، خاموشی سے رخصت ہوگئے ــ نہ ستائش کی تمنا، نہ شکریہ تک کی آرزو ــــ میں نے محسوس کیا کہ ہم ان سپاہیوں کے لئے جو تحفے بھیجتے رہے ہیں، ان کے بجائے اگر ہم ان کے پاس وقتاً فوقتاً

بچوں کو بھیجتے تو یہ ان کے لئے زیادہ عزیز تحفہ ہوتا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ بچوں کو بہت (MISS) کرتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ انہوں نے اس علاقہ کے در و دیوار پر بڑے بڑے جلی حروف سے بہت کچھ لکھا ہے۔ کہیں لکھا ہے۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا!

ایک جگہ لکھا تھا ___ "مسلمان کا مقابلہ دنیا کا کوئی سپاہی نہیں کر سکتا۔"

کہیں یہ لکھا تھا کہ ___ "یاد رکھو! ہم پھر بھی اسے فتح کر سکتے ہیں"۔!

یہ الفاظ ابھر ابھر کر کہہ رہے تھے کہ اس احساس سے کہ ہمیں یہ علاقہ خالی کرنا ہے ان سپاہیوں کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

میں نے اپنی اس روئیداد میں اس علاقہ کی خوب صورتی کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ اس کے لئے اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ (جیسا کہ ہمیں بتایا گیا) وادئ کشمیر اس سے ذرا ہی زیادہ خوب صورت ہے۔ اور اگر یہ واقعہ ہے۔ کہ وادئ کشمیر اس علاقہ سے بھی زیادہ حسین ہے تو فطرت اپنے آپ پر ظلم کرے گی اگر اس وادی کو اُس قوم (ہندو) کے حوالے کر دے، جس کے متعلق بابر نے کہا تھا کہ ذرا ان کی بد ذوقی ملاحظہ کیجئے۔ یہ دریا کے کنارے مکانات بناتے ہیں اور ان کی پُشت دریا کی طرف رکھتے ہیں!

مجھے یقین ہے کہ فطرت اپنے آپ پر کبھی ایسا ظلم نہیں کرے گی!!

## بقیہ "پاکستان کی نئی زیارت گاہیں" (صفحہ ۷ سے آگے)

کے اس عزیمانہ فیصلہ کا ہزار دل سے احترام کریں گی جس نے ہماری تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔

اور اس سیکٹر کی فوج کے جانباز مجاہدو! آپ کی بے مثال جرأت و بسالت پر قوم ہمیشہ فخر کرے گی جس نے اس حقیقت کو بے نقاب کر کے دکھا دیا کہ:۔

مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

آپ کے بھائیوں کی کروڑوں محبت بھری آنکھیں آپ کو سلام کہتی ہیں!

(ایڈیٹر مظفر سیفی۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف مطبوعہ اختر شیبر پریس ایبک روڈ لاہور)

# وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

**لغات القرآن** — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت - پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت - بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

**اسلام کیا ہے؟** — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیبی ایڈیشن (چار روپے)۔

**قرآنی فیصلے** — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔
جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

**سلیم کے نام خطوط** — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔
جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)

**انسان نے کیا سوچا؟** — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت، بارہ روپے

**نظامِ ربوبیت** — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

**ابلیس و آدم** — آدم - ملائکہ - ابلیس - شیطان - جنات - وحی - نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

**من و یزداں** — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

**برقِ طور** — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان، جو یوں کہیے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

**شعلۂ مستور** — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

**سلسبیل** — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

**فجر الاسلام**
**ضحی الاسلام**
مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

**الفتنۃ الکبریٰ** — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں واقعہ کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

**ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور**

Regd. L. No. 7243
MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE


# پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

## انقلاب انگیز کتابیں

### سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے دوسری و تیسری جلد (آٹھ روپے فی جلد)

### انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

## عہد آفریں کتابیں

### لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے مکمل سیٹ پچاس روپے میں۔

## بصیرت افروز کتابیں

### سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

### اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ - آٹھ روپے) (حبیبی ایڈیشن - چار روپے)

## معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور